اترپردیش اردواکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

خبرنامہ

ماہنامہ اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ

جولائی۔اگست ۲۰۲۳ء

اتر پردیش اردو اکادمی

خبرنامہ

جلد : ۵۲ جولائی۔اگست ۲۰۲۳ء شمارہ : ۱، ۲

سرپرست : **چیئرمین**

ایڈیٹر : **سکریٹری**

معاون : **محمد معاذ اختر احسن** (سپرنٹنڈنٹ)

زرسالانہ : پچاس روپے -/50

قیمت فی شمارہ : پانچ روپے -/5

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ،

گومتی نگر لکھنؤ-226010

فون نمبر:0522-4022924

سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر نے امپریشن پرنٹ ہاؤس، لاٹوش روڈ لکھنؤ سے چھپوا کر دفتر اکادمی، واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۲
سلام	ضیاء رحمانی	۳
سلام	ڈاکٹر مخمور کاکوروی	۳
غالب اور غالبیت	ڈاکٹر اجمل بسوانی	۴
غزل	فردوس گیاوی	۱۱
غزل	ڈاکٹر عزیز خیرآبادی	۱۱
مشرف عالم ذوقی: قدآور فنکار	ڈاکٹر سلطان آزاد	۱۲
غزل	ریحانہ عاطف	۱۶
غزل	شاہد ندیم	۱۶
درد ہوشیار پوری: شخص اور شاعر	شاہد پٹھان	۱۷
غزل	عمر شریف مہوی	۲۴
غزل	سلیم تابش	۲۴
صوفی امبا پرساد: آزادی کا شعلہ...	سمیع الدین خاں	۲۵
پندرہ اگست (نظم)	معید رہبر	۳۱
ایک چادر میلی سی: ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر فخر الکریم	۳۲
غزل	سلیم خاور	۳۵
غزل	اعظم صدیقی	۳۵
سلمٰی صدیقی: حیات اور کارنامے	مینا عرفان	۳۶
غزل	فرزانہ پروین	۳۹
اپنے اپنے سکھ دکھ	حبیب ریتھ پوری	۴۰
شجر افکار کے 'خندہ ہائے گل'	مظفر اللہ خاں	۴۴
تبصرہ	مبصر	...
آوارگی بڑھتی رہی (ذہیب افرنگ)	محی بخش	۴۷

●●●

اداریہ

ماہنامہ ’خبرنامہ‘ کا جولائی اوراگست کا مشترکہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ماہ جون میں اردو صحافت کے ۲۰۰ برس مکمل ہونے والے سال میں اُتر پردیش اردو اکادمی نے اردو صحافت پر تین روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا۔ اس سمینار میں ہندوستان کے مشہورومعروف اساتذہ اورصحافیوں نے گراں قدر مقالے پیش کیے۔ یہ مقالے ۲۰۰ برس میں اردو صحافت کے آغاز وارتقااوراس سے متعلق مختلف موضوعات پر پیش کیے گئے۔ اس موقع پر کئی ممتاز صحافیوں کواعزاز سے بھی نوازا گیا۔ اس سمینار کے انعقاد میں اردو اکادمی کے ملازمین نے بڑی محنت کی جس کے باعث یہ سمینار بہت ہی منظّم اور کامیاب رہا۔ اراکین اکادمی باعث مبارک باد ہیں۔ اس قومی سمینار میں پڑھے جانے والے گراں قدر مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے بھی غور وخوض کیا جارہا ہے۔

انہیں دو مہینوں کے درمیان محرم الحرام کے ایام بھی رہے۔ اس کی مناسبت سے رثائی ادب سے متعلق تخلیقات بھی قارئین کے لیے پیش کی گئی ہیں۔

پندرہ اگست کی تاریخ ہماری کامیابیوں اور کامرانیوں کی گراں قدر وراثت کی امین ہے۔ اس برس ملک کو آزادی ہوئے ۷۶ سال مکمل ہوچکے ہیں۔ ہمیں اس تاریخ پر ان لوگوں کی بے تحاشہ یاد آتی ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں اپنی جان کا قیمتی نذرانہ پیش کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ان شہیدوں نے اپنے خون سے تاریخ کو تابناک سرخی عطا کی اور اپنے کارناموں سے ہندوستان کو سربلند کر گئے۔ آج انہیں کے بتائے ہوئے سبق کا اعجاز ہے کہ ہندوستان اپنے روشن مستقبل کی جانب گامزن ہے۔ ان ۷۶ برسوں کا محاسبہ کرنا ہوگا کہ ہم نے ملک کی تعمیر اور ترقی کے سلسلے میں کیا کیا اور کیا نہیں کر سکے۔ بلاشبہ ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت ساری خامیاں رہ گئی ہیں، بہت سارے مسائل حل ہونے ہیں۔ اس دوران غلطیاں بھی ہوئی ہیں لیکن ہم نے غلطیوں سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ اس ۷۶ برس کے طویل سفر میں ہندوستان ترقی پزیر ملک سے ترقی یافتہ ملک بننے کی جانب رواں دواں ہے۔

آیئے اس عزم اور عہد کے ساتھ جشن آزادی منائیں کہ ہم اپنی شاندار تاریخ کی اعلیٰ ترین اقدار کے ساتھ شاہراہ ترقی پر آگے بڑھتے رہیں گے۔ ہماری آزادی ملک میں کثرت میں وحدت کا جلوۂ صد رنگ ہے۔ آپسی بھائی چارہ، قومی یکجہتی اور سالمیت کو فروغ دیں۔ اپنے ملک کی ان تمامتر گنگا جمنی تہذیبی خصوصیات کے ساتھ ہم تمام برادران وطن کی خدمت میں یوم آزادی کے موقع پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

سکریٹری اردو اکادمی

ضیاءؔ رحمانی
مردہی ٹولہ، سیتاپور-Mob.9305669913

سلام

اور رستہ ڈھونڈتے کیوں سبطِ پیغمبرؐ کوئی
کام وہ کرتے نہ تھے بے مرضئ داور کوئی
چھانٹ کر لائے تھے شہ کے ایک ناصر اپنے ساتھ
فخرِ حیدرؓ تھا کوئی تو نازشِ شبرؓ کوئی
قتلِ سرور کے لئے لشکر پہ لشکر آ گئے
مائلِ بیعت نہ کر پایا اُنھیں لشکر کوئی
سینۂ فرزند سے برچھی نکالیں گے حسینؓ
کاش دیکھے ہاتھ اپنے قلب پر رکھ کر کوئی
اے فلک تیرِ ستم اور بر گلوئے شیر خوار
تو نے دیکھا ہے کبھی اس طرح کا منظر کوئی
بیبیوں نے اوڑھ لی تھیں خود رِدائیں صبر کی
ورنہ کس میں دَم تھا ان سے چھینتا چادر کوئی
سر حسینؓ ابن علیؓ کا اور اونچا ہو گیا
زیر اس کو کر نہ پایا نیزہ و خنجر کوئی
کس کے گھر میں ہے بتا دو بیت زہراؓ کے سوا
شافعِ محشر کوئی یا ساقئ کوثر کوئی
یاد رکھو سجدۂ شہ کو نمازوں میں ضیاءؔ
وسوسہ آئے نہ جس سے قلب کے اندر کوئی

●●●

ڈاکٹر مخمورؔ کاکوروی
کاکوری، لکھنؤ-Mob.9450097929

سلام

اسی لئے ہے بلند آپ کا مقام حسینؓ
سوارِ دوشِ پیمبر رہے امام حسینؓ
رضا و صبر کا اک پیکر آہنی ہیں مگر
خلاف ظلم کے شمشیرِ بے نیام حسینؓ
یزید و شمر کی دنیا سے مٹ گئیں نسلیں
لیا ہے وقت نے اِس طرح انتقام حسینؓ
اُنھیں بچانی ہے نانا کے دین کی حرمت
رواں دواں رہِ حق پر ہیں تیزگام حسینؓ
فرات بھی ہوئی اس امر پر ملول بہت
شہید ہو گئے کوفہ میں تشنہ کام حسینؓ
اُسی کو آج بھلائے ہوئے ہیں ہم دل سے
جو کربلا میں دیا آپ نے پیام حسینؓ
اِسی سے قلبِ حزیں کو سکون ملتا ہے
کریں نہ آپ کا کیوں ذکر صبح و شام حسینؓ
بہ فرطِ شوقِ عقیدت، بہ صد خلوص و وفا
زمانہ بھیج رہا ہے تمھیں سلام حسینؓ
یقین ہے مجھے مخمورؔ دست ساقی سے
ملے گا حشر میں کوثر کا ایک جام حسینؓ

●●●

ڈاکٹر اجمل بسوانی
سابق صدر شعبۂ اردو،لعل بہادر شاستری پی جی کالج
آنند نگر،مہاراج گنج-Mob.9450884731

غالبؔ اور غالبیت

غالبؔ کا اصلی نام مرزا اسد اللہ خاں، مرزا نوشہ عرفیت اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا۔ان کے والد مرزا عبد اللہ بیگ تھے جو ریاست الور کے لشکر میں ایک معزز عہدہ پر فائز تھے اور ایک فوجی مہم میں ضرب شدید سے انتقال کر گئے ۔غالبؔ کی پیدائش ۲۷/ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں ہوئی ۔چونکہ مرزا غالبؔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے ان کی پرورش ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے کی لیکن مرزا کی نو سال کی عمر ہی میں وہ بھی فوت ہو گئے ۔نواب احمد بخش بیگ نے بطور ہمدردی مرزا کے خاندان کے لیے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔یہی وجہ ہے کہ غالبؔ تمام عمر ان کے ثنا خواں رہے۔

مرزا کی ابتدائی تعلیم ان کے چچا کی سرپرستی میں آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد اعظم کے زیر نگرانی ہوئی ۔ شاعری کی ابتدا بچپن ہی سے ہو گئی تھی ۔چنانچہ انھوں نے اپنی ایک فارسی غزل اپنے استاد مولوی معظم کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی ۔اُس وقت مرزا کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ نہ تھی۔

۱۸۱۰ء میں جب ان کی عمر ۱۳ سال تھی، ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ جو نواب احمد بخش بیگ خاں کے چھوٹے بھائی تھے، کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔اسی دوران خوش قسمتی سے انھیں ایک ایرانی نژاد نو مسلم عالم ملا عبد الصمد مل گیا۔ وہ بغرض سیر و سیاحت آگرہ سے آیا ہوا تھا مرزا نے اس سے دو سال تک فارسی زبان سیکھی، اسی لیے ان کو اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا۔

مرزا چونکہ ابتدائی عمر میں یتیم ہو گئے اور نانا نے ان سے کردار کی بابت کبھی باز پرس نہیں کی اس لیے وہ نوجوانی میں راہ راست سے بھٹک گئے مگر بہت جلد انھوں نے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر لی۔البتہ دختِ رز سے ان کا تعلق آخر وقت تک قائم رہا۔

مرزا نے ۱۸۱۲ء میں اپنے آبائی وطن آگرہ کو خیر باد کہہ کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔اس نقل مکانی سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ یہاں آکر ان کی راہ و رسم ایسے ایسے گراں مایہ اشخاص سے ہوئی جن کی ذات سے انھیں گونا گوں علمی و اخلاقی فائدے حاصل ہوئے ۔ان گراں قدر

ہستیوں میں مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم مومن خاں مومن اوران سب کے سرخیل علامہ فضل حق خیرآبادی جیسے لوگ تھے۔موخرالذکر علامہ موصوف تو غالب کے پیرومرشد ہی تھے جوان کی قدم قدم پراخلاقی وادبی رہنمائی کرتے تھے۔

چونکہ غالب نے نہایت اعلیٰ درجہ کا دل ودماغ پایا تھااوران میں اپنی اصلاح کی صلاحیت بھی موجودتھی اس لیے انھوں نے ہرگوشہ سے فائدہ اٹھایا۔اسی کی بدولت ان کا فن آسمان پر پہنچ گیا۔انگریزوں نے جوپنشن مرزا کے خاندان کے لیے مقرر کردی تھی، وہ ریاست فیروز پورجھرکہ سے ملتی تھی۔مرزاجب تک صغیرسن رہےاس پرقانع رہےلیکن شادی کے بعدان کی خانگی ضروریات بہت بڑھ گئیں اوروہ مقروض ہوگئے۔ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ریاست سے جس قدر پنشن ملنی چاہیےاس قدرنہیں ملتی لہٰذا کلکتہ پہنچ کرحکومت عالیہ میں استغاثہ دائرکرنالازمی ہے۔

مرزا غالبؔ ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور کانپور ہوتے ہوئےلکھنؤ پہنچے۔یہاں علم دوست حضرات نے بڑی عزت اورمحبت کے ساتھ ان کا خیرمقدم کیا۔محفل مشاعرہ بھی منعقدکی۔لکھنؤ میں ایک سال تک قیام کے بعد یہ بنارس پٹنہ ہوتے ہوئے فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے لیکن ڈیڑھ سال سے زیادہ قیام کے بعد بے نیل ومرام نومبر ۱۸۲۹ء میں دہلی واپس آگئے۔یہاں آکر ریزیڈنٹ دہلی کی عدالت میں استغاثہ دائرکیا جس کا فیصلہ ۱۸۳۶ء میں یہ ہوا کہ جوپنشن انھیں ملتی ہےاس میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔مگرمرزانے ہمت نہیں ہاری۔انھوں نے حکومت کولکھا کہ میرا مقدمہ ولایت بھیجا جائے لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ان کے خلاف فیصلہ دیا۔آخرکارانھوں نے ملکہ انگلستان کی خدمت میں اپیل کی لیکن ناکامی ہاتھ آئی۔بالآخر ۱۸۴۴ء میں بالکل مایوس ہوکر بیٹھ گئے۔

مرزانے اپنی پنشن میں اضافہ کے لیے مسلسل سولہ سال جدوجہد کی اوراس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی باقی ماندہ عمراس قرضہ کے ادا کرنے میں کٹ گئی جوانھوں نے مقدمہ کے سلسلہ میں مہاجنوں سے لیا تھا۔یہ شعرمرزا کی باطنی کیفیات کی بھرپورعکاسی کرتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

چونکہ مرزا انتہائی مالی مشکلات میں گرفتار ہو چکے تھےاس لیے دوستوں کے مشورہ سے قلعہ کی ملازمت پرآمادہ ہوگئے۔جولائی ۱۸۵۰ء میں حکیم احسن اللہ خاں مدارالمہام اورمولانانصیرالدین عرف کالے میاں صاحب کی سفارش پر بہادرشاہ ظفرنے ان کوخلعت فاخرہ اور''نجم الدولہ دبیرالملک'' کا خطاب عطا کیا۔پچاس روپیہ ماہوارتنخواہ پرخاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے لیے مامورکیا۔ملازمین شاہی کو ہرششماہی کے بعد چھ ماہ کی تنخواہ ملتی تھی۔مرزا اتنا طویل انتظار کیسے برداشت کرتے اس لیے جنوری ۱۸۵۱ء میں انھوں نے ایک منظوم گذارش کی جس کا مضمون یہ تھا کہ ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ دیجے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

چنانچہ ان کو ہر مہینہ تنخواہ ملنے لگی اور یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا اس وقت مرزا محلّہ بلی ماروں میں رہتے تھے۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ جب ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو دیسی فوج شہر میں داخل ہوئی تو میں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔

ہنگامہ کے آغاز میں مرزا کی بیوی نے اپنے زیورات اور گھر کا قیمتی سامان کالے صاحب کے یہاں بھیج دیا تھا مگر جب ۱۸ر دسمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی فتح کی تو میاں صاحب کے مکان کے ساتھ مرزا صاحب کا سامان بھی لٹ گیا۔ اس ہنگامہ میں مرزا کی جان تو سلامت رہی مگر سرکاری پنشن اور قلعہ کی تنخواہ بند ہو جانے سے ان کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۰ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو پٹیالہ کے سپاہیوں کی روک ٹوک کے باوجود چند گورے دیوار پھاند کر محلّہ میں داخل ہو گئے اور مرزا اور ان کے چند ہمسایوں کو پکڑ لے گئے اور کرنل براؤن کے سامنے پیش کیا۔

کرنل نے مرزا سے پوچھا، ''کیا تم مسلمان ہو؟'' مرزا نے جواب دیا، ''حضور! آدھا مسلمان ہوں۔'' وہ حیران ہو کر بولا ''یہ آدھا مسلمان کیسا ہوتا ہے؟'' مرزا نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا ''جناب شراب پیتا ہوں، سور نہیں کھاتا۔'' یہ جواب باصواب سن کر کرنل ہنسنے لگا اور مرزا کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اسی ہنگامہ کے دوران ۱۸ر اکتوبر کو مرزا کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا۔ ہمسایوں کو ان کی بیکسی پر رحم آیا۔ وہ لوگ مہاراجا پٹیالہ کے دو تین سپاہیوں کو ساتھ لے کر فراش خانہ پہنچے اور بمشکل تمام محلّہ کی مسجد کے صحن میں قبر کھود کر میت کو دفن کیا۔ اس ہنگامہ میں مرزا کے دوستوں نے ان کی ہر ممکن مدد کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ اور لالہ مہیس داس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا کی مالی حالت بہت خستہ ہو گئی تھی اس لیے انھوں نے نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کو لکھا کہ آپ میرا مستقل وظیفہ مقرر کر دیجیے۔ چنانچہ انھوں نے سَو روپیہ ماہوار مقرر کر دیے جو مرزا کو تا عمر ملتے رہے۔ نواب موصوف کی دعوت پر جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا رام پور گئے اور مارچ میں واپس آئے۔ نواب رام پور کی سعی سے مرزا کی پنشن بھی دوبارہ جاری ہو گئی۔ ۱۸۶۰ء میں ان کو یک مشت تین سال کی پنشن مل گئی اور ۱۸۶۳ء میں مرزا کی کوشش ہی سے دربار کی حاضری اور خلعت کی بازیابی بھی ہو گئی۔ ۱۸۶۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہو گیا اور نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ اس لیے مرزا اول الذکر کی تعزیت اور آخر الذکر کی تہنیت کے لیے اکتوبر ۱۸۶۵ء میں دوبارہ رام پور گئے اور جنوری ۱۸۶۶ء میں دہلی واپس آئے۔

۱۸۶۶ء سے مرزا کی صحت خراب رہنے لگی۔ جوانی کی بے اعتدالیوں اور شراب نوشی نے ان کی صحت بالکل تباہ

کر دی تھی۔مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ثقل سماعت اور ضعف بصارت دونوں لاحق تھے۔پلنگ پر پڑے رہتے تھے اور غذا بھی کچھ نہیں رہی تھی۔مرنے سے چند روز پیشتر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔وفات سے ایک دن پہلے دماغ پر فالج گرا اور اسی بے ہوشی کی حالت میں ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ءکو دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نواب ضیاالدین احمد خاں نے ان کو اپنے آبائی قبرستان، جو بستی نظام الدین میں تھا، اہل سنن کے طریقہ پر دفن کیا۔لوح مزار پر میر مہدی مجروحؔ کا قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔مصرع تاریخ یہ ہے۔

ہاتف نے کہا ''گنج معانی ہے تہہ خاک''

۱۲۸۵ھ

مولانا حالی جنھوں نے مرزا کو بہت قریب سے دیکھا تھا، ان کے اخلاق اور جودت ذہن کے متعلق رقم طراز ہیں۔''مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے جو شخص ان سے ایک دفعہ مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔'' وہ آگے لکھتے ہیں ''جیسی مرزا کی طبیعت میں درّاکی اور ذہن میں جودت تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ کتاب کرایے پر منگاتے اور دیکھ کر واپس کر دیتے مگر جو کام کی بات کتاب میں نظر آجاتی وہ دل پر نقش ہو جاتی۔''

مرزا کے فکر شعر کا طریقہ یہ تھا کہ رات کو عالم سرخوشی میں فکر سخن کیا کرتے تھے اور صبح اٹھ کر صرف یاد کے سہارے سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔شعر فہمی اور کتاب فہمی میں بھی وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے۔کیسا ہی مشکل شعر یا مضمون ہو ایک سرسری نظر میں اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔

مرزا کے مزاج میں ظرافت اس قدر تھی کہ ان کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ داد سخن کے باب میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب تک ان کو کوئی شعر فی الواقع پسند نہ آتا تھا وہ ہرگز اس کی تعریف نہیں کرتے تھے لیکن جو شعر ان کے دل میں چبھ جاتا تھا اس کی تعریف میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔مومنؔ کا جب یہ شعر سنا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو بہت تعریف کی اور کہا ''کاش مومنؔ میرا سارا دیوان مجھ سے لے لیتا اور یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔'' اسی طرح مرزا کے کلام پر کوئی شخص ٹھیک اعتراض کرتا تھا یا کوئی عمدہ تصرف کرتا تھا تو اس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ایک فارسی قصیدہ کا شعر تھا۔

ہمچناں در تتق غیب نمودے دارند
بوجودیکہ ندارند ز خارج اعیاں

جب یہ شعر مولانا فضل حق خیرآبادی کو سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے اس کی جگہ ثبوت بنا دو۔ چنانچہ مرزا نے نمودے کے بجائے ثبوتے بنا دیا۔

مذہب کے لحاظ سے مرزا اثنا عشری شیعہ تھے جیسا کہ اپنے شاعرانہ رنگ میں حضرت علی کی تعریف کرتے ہیں۔

غالب نام آورم، نام و نشانم مپرس
ہم اسد اللہ ام ہم اسد اللّٰہی ام

مرزا نے فارسی اور اردو نظم ونثر میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، فارسی نثر میں پنج آہنگ، مہرنیم روز، دستنبو، قاطع برہان اور درفش کاویانی ہیں۔ فارسی نظم میں کلیات نظم فارسی، سبدچین، دعائے صباح اور متفرقات غالب ہیں۔ مرزا کی اردوشاعری دیوان غالب کی شکل میں عجوبۂ روزگار ہے۔ حالانکہ انھیں اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ خود کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگا رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

مرزا کی اردو نثر میں عود ہندی، اردوئے معلیٰ، مکاتیب غالبؔ، نادرات غالبؔ اور مرزا کی اور نکات غالب ہیں۔ ان سب کے علاوہ انھوں نے عارفؔ کے بچوں کے لیے ایک آٹھ صفحہ کا رسالہ قادر نامہ تصنیف کیا تھا۔ اس کا پہلا شعر ہے۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبی مرسل پیمبر رہنما

جہاں تک غالبؔ کی شاعری کے ارتقا کا سوال ہے ان کے کلام میں چار قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں۔

(۱) کچھ اشعار وہ ہیں جو پیچیدہ اور مغلق ہیں۔ یہ بالکل چیستاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اشعار طرز بیدلؔ میں کہے گئے ہیں۔ خود کہتے ہیں۔

طرز بیدلؔ میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

(۲) بعض اشعار ایسے ہیں جن میں انھوں نے لفظوں کا طلسم باندھا ہے۔ یہ اشعار کوہ کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہیں۔ ان میں ناسخ کا رنگ یعنی ایہام اور رعایت لفظی پائی جاتی ہے۔

(۳) کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں مضمون آفرینی بھی ہے اور دلکش انداز بیان بھی۔ ان میں مومنؔ کا رنگ موجود ہے۔

(۴) بعض اشعار تیرونشتر کا کام کرتے ہیں۔ ان میں شعریت ہے۔ زبان صاف اور بندش نہایت دلکش ہے۔ ان میں خیالات کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ اشعار میرؔ کے انداز میں ہیں۔

جہاں تک مرزا کے کلام کی خصوصیات کی بات ہے ان کی سب سے پہلی خصوصیت ان کا انداز بیان ہے۔ اس بات کا اشارہ ان کے شعروں میں بھی ملتا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

....

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

اسی انداز بیان یا ادائے خاص پر انھیں ناز بھی ہے کیا خوب فرمایا ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

غالبؔ کی دوسری بڑی خصوصیت ان کی دشوار پسندی ہے۔معمولی سے معمولی مضمون کو وہ عسیرالفہم بنادیتے ہیں ۔مرزا کی اسی دشوار پسندی کا مذاق ان کے ہم عصر شاعر قیسؔ نے یوں اڑایا ۔

اگر اپنا کہا خود آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

اس کے علاوہ مرزا پر مہمل گوئی کا الزام بھی تراشا گیا۔مرزا نے اس کے جواب میں یہ فرمایا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن مرزا کو اپنی دشوار پسندی کا احساس بھی تھا جیسا کہ اس رباعی سے مترشح ہوتا ہے ۔

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ان کی شاعری کی تیسری خصوصیت ان کا رمزیہ انداز ہے جسے ہم سادگی اور پرکاری بھی کہہ سکتے ہیں جیسے ۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ان کے کلام کی چوتھی خصوصیت ایجاز ہے جو دریا کو کوزہ میں بند کردینے کا دوسرا نام ہے۔خود کہتے ہیں ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
وہ لفظ جو غالب مرے اشعار میں آئے

بطور مثال یہ شعر دیکھیں ۔

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

ان کے کلام کی پانچویں خصوصیت ظرافت ہے جس میں مزاح، شوخی، طعن اور طنز سبھی شامل ہیں۔انھیں ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں ۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

....

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

....

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

....

چاہتے ہو خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

....

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اکثر اشعار کا مضمون پہلو دار ہوتا ہے یعنی غور سے دیکھنے پر شعر میں دوسرے لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں جیسے۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کلام انتہائی دلکش اور دل نشین ہے۔ یہ دلکشی یا دلنشینی جذبہ اور تخیل کے حسین امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر دیکھیں۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہوجانا

....

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

....

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

....

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ انھیں بعض الفاظ بہت محبوب ہیں جنھیں انھوں نے بارہا استعمال کیا ہے جیسے، جوہر آئینہ، رنگ، نیرنگ، جلوہ، موج، سیلاب، عدم، ہستی، خمیازہ، صیقل، برق، جادہ وغیرہ۔

نویں خصوصیت حقائق نگاری ہے۔ انھوں نے انسانی فطرت کا بہت غور وخوض کے ساتھ مطالعہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ تحریر وتقریر میں جس قدر ان کے اشعار مستعمل ہوتے ہیں کسی اور شاعر کے نہیں۔

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے رشک کے پامال مضمون کو بڑی جدت طرازی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ رشک کے جتنے مدارج ہو سکتے ہیں سب بیان کر دئے ہیں۔ بطور مثال دو شعر ملاحظہ ہوں۔

گذرا اسدؔ مسرت پیغام یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

....

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

گیارہویں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا ہے اور بارہویں خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے اردو غزل کو فلسفیانہ مسائل سے روشناس کرایا۔ ان سے پہلے غزل میں تصوف تو موجود تھا مگر فلسفہ طرازی نہ تھی اور اسی کو ہم غالبیت کا نام دیتے ہیں۔

❑❑❑

فردوس گیاوی
عارف نگر، گیوال بیگھہ، گیا-Mob.9546037777

غزل

سر سے ہے پیر تک جو لپٹی خاک
ہو گئی یار اپنی ہستی خاک

لوگ خوش تھے یہاں چراغاں تھا
کس طرح ہو گئی یہ بستی خاک

مجھ کو بے حد سکون دیتی ہے
میرے ماتھے پہ مَل دو تھوڑی خاک

پاؤں رکھتا نہیں تھا خاک پہ جو
آج اس نے بھی دیکھ اوڑھی خاک

اس کو چومو لگا لو آنکھوں سے
دوستو! یہ تو ہے وطن کی خاک

سنگ مرمر تمہیں مبارک ہو
مجھ کو لگتی ہے اچھی میری خاک

کہہ دو فردوسؔ قبر پر میری
ڈالے وہ بھی تو ایک مٹھی خاک

●●●

ڈاکٹر عزیزؔ خیرآبادی
خیرآباد، سیتاپور-Mob.9450901544

غزل

گلشن سے کاروبارِ وفا کون لے گیا
خوش رنگ طائروں کی صدا کون لے گیا

احساسِ تازگی کی فضا کون لے گیا
خوشبو ترے بدن سے صبا کون لے گیا

دیوانہ تھا کہ تیری گلی کا کوئی مرید
دامن میں بھر کے سنگ جفا کون لے گیا

آتش کدہ ہے صورتِ گلزار دیکھ لے
نمرود سب غرور ترا کون لے گیا

عریاں ہے شاخ شاخ پرندے بھی سب ملول
اشجار کے بدن سے قبا کون لے گیا

کچھ سوچ کر بتا کہ ترے جھوٹ کے سوا
ذہنوں سے اعتبار ترا کون لے گیا

حیراں ہوں اے عزیزؔ توکل کے ساتھ ساتھ
جینے کی آن، بان، ادا، کون لے گیا

●●●

سلطان آزاد
پنولین،گلزار باغ،پٹنہ -Mob.8789934730

مشرف عالم ذوقی: ایک قدآور فنکار

تاریخ شاہد ہے کہ بہار علم وادب کا ایک قدیم گہوارہ رہا ہے۔ یہاں شاعری کے علاوہ تخلیقی نثر میں اردو فکشن اور ناول نگاروں کی شناخت پوری اُردو دنیا میں ہوئی ہے۔اُردو فکشن اور ناول میں نت نئے نئے تجربے اور نئے افکار ادبی دنیا کو بہار کے فنکاروں نے پیش کئے ہیں۔ جسے ناقدین ادب نے نہ صرف سراہا بلکہ اس کی تحسین بھی کی۔ جب ہم اُردو ناولوں کا مطالعہ اور جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ناول لکھنے والوں کی جو تعداد پورے ہندوستان میں موجود ہے،اس کا بڑا حصہ بہار سے تعلق رکھتا ہے۔ بہار کے اردو ناول نگاروں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''بہار کے ناول نگاروں نے اکیسویں صدی کی موجودہ زندگی کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ شاید ہی عوام وخواص کی زندگی کی کوئی صورت ان کی گرفت اور اظہاریت سے چھوٹی ہو۔ آج کی رنگارنگ زندگی،معاشرے پر مغربی دباؤ اور اثرات معاشی صورتیں،نفسیاتی پیچیدگیاں،جنسی اور سیکسی رویے، سیاست کے داؤں پیچ، استحصال کے نئے نئے رُوپ اور ہر پل نئے تجربات سے دوچار ہوتا سماج بیان کے کھلے اور ڈھکے چھپے دونوں طریقے سے ان ناولوں میں موجود ہے۔''

(بحوالہ: مضمون بہار میں اردو ناول نگاری،کل سے آج تک از ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی مشمولہ بہار کا معاصر ادب نمبر،جلد اوّل،صفحہ۔494)

اُردو ناول کا جب ذکر آتا ہے تو اس صوبہ بہار سے اپنی خصوصی شناخت بنانے والوں میں اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری،الیاس احمد گدّی، شفق، عبدالصمد، حسین الحق، شوکت خلیل، پیام آفاقی، شموئل احمد غضنفر اور مشرف عالم ذوقی وغیرہ کے اسمائے گرامی ادبی دنیا میں مشہور ومعروف ہوئے۔

مشرف عالم ذوقی، بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے نمائندہ اور عالمی شہرت یافتہ اردو فکشن اور ناول نگار تھے۔ان کی پیدائش بہار کے شہر آرہ میں 24 نومبر 1963ء میں ہوئی تھی۔اگرچہ ان کی تاریخ پیدائش ڈاکٹر قیام نیّر نے اپنی کتاب ''بہار میں تخلیقی نثر'' جلد دوم میں 24 مارچ 1962ء درج کی ہے۔ممکن ہے کہ اصل اور سند کے اعتبار سے دو طرح کی تاریخ پیدائش درج ہوگئی ہوں۔

انھوں نے مگدھ یونیورسٹی بہار سے اُردو میں ایم۔اے کیا۔ان کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ سے ہوا۔ان

کا پہلا افسانہ ’’رشتوں کی صلیب‘‘ ماہنامہ کہکشاں ممبئی میں شائع ہوا تھا۔شہر آرہ سے دہلی گئے تو صحافت کا سہارا لیا۔ جہاں اُنھیں نت نئے حالات، اندرون ملک اور بیرون ممالک میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات اور انقلابات نے ان کی حِسّیت کو جگایا۔ طبیعتاً بے باک اور نڈر ہونے کے ساتھ جنوین (Genuine) صحافت نے اُنھیں کافی جھنجھوڑا۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور پھر ناولوں کے ذریعے اپنی آوازیں بلند کرنی شروع کردیں۔

مشرف عالم ذوقی اُردو کے اُن چند مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں تھے، جنہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ کم وقت میں بہت سارے افسانے اور ناول لکھے۔ جسے باذوق قارئین کی دادو تحسین حاصل ہوئی اور ناقدین ادب نے بھی خوب سراہا۔

بلاشبہ ان کی نگارشات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ کافی تیز اور بے حد گہرا تھا۔ ملک اور دُنیا میں ہورہے انقلاب اور تغیرات پر ان کی گہری نظر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں پورا منظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ صحافت سے وابستگی نے اُنھیں ایک حساس، باخبر اور متحرک قلم کار بنا دیا۔ یعنی صحافت نے ان کے فن کاری میں جلا بخشی۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں ’’ذبح‘‘، ’’بیان‘‘، ’’شہر چُپ ہے‘‘، ’’مسلمان‘‘، ’’نیلام گھر‘‘، ’’پوکے مان کی دنیا‘‘، ’’پروفیسر ایس کی عجیب داستان‘‘، ’’سونامی‘‘، ’’لے سانس بھی آہستہ‘‘، ’’آتش رفتہ کا سراغ‘‘، ’’نالہ شب گیر‘‘ اور ’’عقاب کی آنکھیں‘‘ قابل ذکر ہیں۔

ان کے ناولوں میں اگر پوری قوم کا سانحہ اور المیہ ہے تو کچھ ناولوں میں غربت، مفلسی اور بے روزگاری کے اہم مسائل کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ کہیں سیاسی گندگیوں سے باخبر کیا تو کہیں بین الاقوامی مسائل کو بھی پیش کیا۔ اخلاقیات کی پامالی اور نئی نسل کی تباہی و بربادی کا منظر نامہ بھی ان کے ناولوں میں اجاگر ہوتا ہے۔ ان کا سب سے مشہور ناول ’’بیان‘‘ جو 6 دسمبر 1992ء کے المناک اور تاریخی سانحہ پر مبنی ہے۔ اس پر کئی اہم ناقدین نے توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیّر اس ناول پر اپنا تاثر اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ’’بیان، مشرف عالم ذوقی کا رونگٹے کھڑے کردینے والا اور جذبات کو جھنجھوڑ دینے والا ایک شاہکار ناول ہے۔ اس کی کہانی بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فساد کے اردگرد گھومتی ہے۔ مصنف نے واقعات کو اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ وہ منظر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔‘‘
>
> (بحوالہ: بہار میں تخلیقی نثر: آزادی کے بعد، جلد اوّل، از ڈاکٹر قیام نیّر، مطبوعہ 2014ء، صفحہ 84)

ڈاکٹر محسن رضا رضوی ناول ’’بیان‘‘ پر اپنا تاثر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’ناول ’’بیان‘‘ کا موضوع اور مواد 6 دسمبر 1992 کے المناک تاریخی سانحہ سے تیار کیا گیا ہے اور اس سانحہ کے بعد کی سیاسی وسماجی صورت حال کا جائزہ نہایت جرأت مندی اور بے باکی سے لیا گیا ہے۔‘‘
>
> (بحوالہ: بہار میں اردو نثر: بڑھتے قدم، از ڈاکٹر محسن رضا رضوی، مطبوعہ 2020، صفحہ 47)

ناول ''بیان'' پر ایک تبصرہ کے آخری حصّہ میں محبوب الرحمٰن لکھتے ہیں:

''اُردو کا یہ پہلا ناول ہے جس میں ناول نگار انجام سے بے پرواہو کر بغیر کسی خوف اور ڈر کے اور بغیر کسی جھجھک کے ملزموں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ناول میں بہت سی ضمنی باتیں اور ضمنی کردار بھی ہیں، جو پلاٹ کو آگے بڑھانے میں مدد کرتی ہیں۔''

(بحوالہ تبصرہ: ناول ''بیان'' مبصر محبوب الرحمٰن، ماہنامہ آجکل، دہلی، فروری 1996ء، صفحہ 44)

مختصر یہ کہ ناول ''بیان'' ہندوستان کی سیکولرازم کی بنیادوں کو ہلا دینے والا 6 دسمبر 1992ء کا واقعہ اور اس سے پیدا ہونے والے حالات اور اس کے بعد کے سیاسی اور بدلتے سماجی حالات کا منظر نامہ ہے۔

جب اُردو فکشن کی بات آتی ہے تو اس صوبہ بہار کے حوالے سے کئی اہم افسانہ نگار سامنے آتے ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، سید محمد محسن، شکیلہ اختر، غیاث احمد گدّی، ذکی انور، انور عظیم، احمد یوسف، شفیع جاوید، الیاس احمد گدی، شبیر احمد، شفیع مشہدی، عظیم اقبال، رضوان احمد، علی امام، شوکت حیات، اعجاز شاہین، شمیم صادقہ، شہناز فاطمی، اقبال حسن آزاد، قیام نیّر، عبدالصمد، سید احمد قادری، فخر الدین عارفی، پیغام آفاقی، سلطان آزاد، مجیر آزاد اور مشرف عالم ذوقی وغیرہ۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے ہر ادبی تحریک میں اپنی پہچان بنائی۔

مشرف عالم ذوقی کے افسانوی مجموعے میں ''بھوکا ایتھوپیا''، ''فریج میں عورت''، ''غلام بخش''، ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے''، ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بہت کم عرصے میں ایک اندازے کے مطابق دو سے ڈھائی سو افسانے لکھے جو ملک کے بیشتر موقر رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کی تیز رفتاری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر تخلیقی عناصر اور جوہر بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان کے افسانوں کے خصوصی موضوعات انسانی ہمدردی، محبت واخوت، اخلاقی اقدار، سیاسی بدحالی بین الاقوامی حالات اور سماجی گراوٹ وغیرہ رہے ہیں۔ دنیا کے بدلتے حالات وواقعات سے آگاہی کے ساتھ ایک نئی دنیا ان کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محسن رضا رضوی لکھتے ہیں:

''مشرف عالم ذوقی راست بیانیہ کی بنیاد پر خارجی واقعات کی پیش کش میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا بالیدہ سماجی اور سیاسی شعور ملک میں آئے دن برپا ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ قومی اتحاد کی فضا کو مستحکم بنانے اور آزادی کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں ذوقی کا فن ایک آلہ کار کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ معاشرے کو بہتری اور بہبود کی طرف لے جانے، ماحول سے ریاکاری کو ختم کرنے اور قومی اتحاد کے ذریعہ اس سرزمین کو جنّت نشاں بنانے کا خواب ذوقی کے یہاں نئے انداز میں نمودار ہوتا ہے۔''

(بحوالہ: کتاب ''بہار میں اردو نثر: بڑھتے قدم''، از ڈاکٹر محسن رضا رضوی، مطبوعہ 2020، صفحہ 83)

مشرف عالم ذوقی کی جدت طرازی اور ان کے مثبت افکار ان کے افسانوں کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم رقم طراز ہیں:

''مشرف عالم ذوقی، جدید ایجادات کی تباہ کاریوں سے نہ صرف ہمیں آگاہ کرتے ہیں، بلکہ ترقی کے زینے چڑھتا ہوا انسان کس قدر بے حس اور بے مروّت ہوجاتا ہے، قدروں کا زوال کس تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ ایک طرف انسان بایوٹکنالوجی، جنیٹک انجینئرنگ، نیوٹکنالوجی کی دنیا میں گُم ہوتا جارہا ہے تو دوسری طرف اس ترقی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے منفی اثرات نے سماج کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہری چمک دمک اور اُڑان کے درمیان اس کی داخلی دنیا سیاہ ہوچکی ہے۔ اور ایک عجیب سے بکھراؤ، زوال، انتشار کے دائرے میں وہ قید ہوگیا ہے۔''

(بحوالہ: معاصر افسانہ اور ذوقی از ڈاکٹر شہزاد انجم مطبوعہ 2011ء ص63)

مشرف عالم ذوقی نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں مقبول ہوئے بلکہ نثری موضوعات کے تحت کئی تنقیدی مضامین کے مجموعے کے سبب تنقید نگاری میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں ''آب رواں کبیر'' اور ''جدید افسانے: 1970 کے بعد'' بھی بے حد مقبول ہوئے۔ انھوں نے کئی اہم شخصیتوں پر خاکے بھی لکھے، جو مشہور ہوئے۔ ان میں ''منٹو ہندوستانی''، ہاجرہ مسرور''، ''وہ یہیں کہیں آس پاس ہے'' (ساجد رشید) اور ''سناٹے میں ایک تارہ'' (انور عظیم) وغیرہ ان کے کامیاب خاکے ہیں۔ ان کے خاکوں میں بھی انھیں انفرادیت حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ مشرف عالم ذوقی برصغیر کے صاحب طرز ادیب، ناول نگار، اسکرپٹ رائٹر، اور فکشن نگار تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں برصغیر کے حالات خصوصی طور پر اقلیتی طبقوں کے مسائل اور سماجی وانسانی سروکاروں کی بھرپور اور سچی ترجمانی کی۔ ایسے قلمکار دُنیا میں کم ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی ہر بات کو بے خوف ہوکر آزادی کے ساتھ اُٹھایا ہو۔ اُن میں مشرف عالم ذوقی کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات اُنھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ان کے فنکارانہ اوصاف اور عظمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ایک قدآور فن کار کہہ سکتے ہیں۔ افسوس کہ ایسا ذہین اور روشن دماغ قلم کار محض 58 سال کی عمر میں اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔

حوالے:۔

(۱) بہار کا معاصر ادب نمبر، جلد اوّل، مژگاں، کولکاتا۔
(۲) بہار میں تخلیقی نثر آزادی کے بعد، جلد اوّل اور جلد دوم، ڈاکٹر قیام نیّر۔
(۳) بہار میں اردو نثر: بڑھتے قدم، ڈاکٹر محسن رضا رضوی۔
(۴) معاصر افسانہ اور ذوقی، ڈاکٹر شہزاد انجم۔
(۵) ناول ''بیان'' تبصرہ رسالہ آجکل، دہلی، فروری ۱۹۹۶ء۔

❑❑❑

ریحانہ عاطفؔ خیرآبادی
خیرآباد، سیتاپور-Mob.9450374214

غزل

زندگی کا سخت کتنا امتحاں ہے ان دنوں
شیشۂ دل پتھروں کے درمیاں ہے ان دنوں

رشتۂ انسانیت کی پائمالی دیکھ کر
زندگانی درد وغم کی داستاں ہے ان دنوں

جوہر خُلق و محبت ہاتھ سے کس کے گیا
سوچئے کردار کا کس کے زیاں ہے ان دنوں

اِس کی خوبی کو نہ چھو پائی کہیں کوئی زباں
اپنے لہجے میں الگ اردو زباں ہے ان دنوں

جو تقاضے وقت کے کرتا ہے پورے وہ بشر
زندگی میں ہر قدم پر کامراں ہے ان دنوں

وہ تصور میں مرے رہنے لگے ہیں اس لئے
مہکا مہکا شاعری کا گلستاں ہے ان دنوں

اب تو ہر منظر سخنور کے قلم کی زد میں ہے
شاعری سچائیوں کی ترجماں ہے ان دنوں

●●●

شاہد ندیمؔ
چون پڑان، آگرہ-Mob.9760929444

غزل

مرے اپنوں نے اکثر رکھ دئے ہیں
مری راہوں میں پتھر رکھ دئے ہیں

اُڑانوں کا سفر مشکل نہیں تھا
کسی نے پر کتر کر رکھ دئے ہیں

وفا کی راہ میں اہل وفا نے
کبھی آنکھیں کبھی سر رکھ دئے ہیں

جلا کر پھر دیے ہم نے یقیں کے
ہواؤں کے برابر رکھ دئے ہیں

صدائے وقت نے آنسو سمجھ کر
مری پلکوں پہ گوہر رکھ دئے ہیں

مری آنکھوں میں میری مفلسی نے
کئی موسم کے منظر رکھ دئے ہیں

ندیمؔ اک سچ کی خاطر اس جہاں نے
مرے سینے پہ خنجر رکھ دئے ہیں

●●●

شاہد پٹھان

جے پور، راجستھان Mob.9372843907

دردؔ ہوشیار پوری: شخص اور شاعر

(آمد:1937۔رخصت:2012)

میری تلاش میں ہیں مضامینِ نو بہ نو
الفاظِ نیم جاں کا مسیحا رہا ہوں میں
لازم ہے میرے شعر سمجھنے کے لیے دردؔ
ہر موسمِ تازہ کے اشارات سمجھنا

پریم سوشیل دردؔ ہوشیار پوری کا شمار راجستھان کے اُن غیر مسلم شعرائے کرام میں ہوتا ہے جنھیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کی بھی آ گہی حاصل تھی۔ یہ ادبا وشعرا ریاستی دَور کے پروردہ تھے اور اپنی مادری (اور ثانوی) زبان 'اردو' لکھا کرتے تھے۔ بسملؔ بھرت پوری، لکشمی نارائن فارغؔ، بلرام کھونسلہ واقفؔ، چاندنرائن مہرؔ، چاند بہاری لال صباؔ، مدان ہوشؔ سرحدی وغیرہ اسی زمرے میں شامل ہیں۔

پریم سوشیل ابرول دردؔ ہوشیار پوری 6رمئی 1937 کو بمقام ہوشیار پور(پنجاب) پیدا ہوئے۔سرکاری اسکولوں میں انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی بھی پڑھی۔طالب علمی کے زمانے میں انھیں دوسرے شعرا کے علاوہ اقبالؔ کے سیکڑوں اشعار حفظ تھے۔اُس وقت پنجاب کے بیشتر سرکاری مدارس میں اردو و فارسی کا معقول انصرام تھا۔دردؔ صاحب جودھ پور سے انجینئرنگ (Civil Engineer-1959) کی تعلیم مکمل کر کے محکمۂ آبپاشی (Irrigation Department) (پرتاپ گڑھ) میں ملازم ہوئے۔کچھ عرصہ بعد بانسواڑہ (1976) تعینات ہوئے۔مضطرؔ صدیقی بانسواڑہ میں پہلے سے موجود تھے،ان کی صحبت میں دردؔ کا شاعری کے تئیں استغراق فزوں ہوا۔پھر رتلام سے بسملؔ نقشبندی،کوٹہ سے ظفرؔ غوری اور سرونج سے ڈاکٹر شاہدؔ میر بھی وہاں آباد ہوگئے۔ان شعرا نے بانسواڑہ میں ادبی انجمنیں قائم کیں اور متعدد یادگار مشاعرے منعقد کرائے۔بسملؔ نقشبندی اور ڈاکٹر شاہدؔ میر نے نوجوان شعرا کی تربیت بھی کی اس سے وہاں شعروادب کا خوش گوار ماحول بن سکا، دردؔ ہوشیار پوری ادبی فضا بنانے میں دامے، درمے،قدمے، سخنے شریک رہے۔ دردؔ 1995 کو ڈونگر پور راجستھان کے محکمۂ آبپاشی سے بطور اسسٹنٹ انجینئر سبکدوش ہوکر گلابی شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ جے پور آنے کے بعد دردؔ صاحب یہاں کی ادبی انجمنوں اور شعری نشستوں میں بھی شریک ہونے لگے تھے۔راقم الحروف کی دردؔ صاحب سے پہلی ملاقات سید معظم علی کی منعقد کردہ

ایک شعری نشست (شاہد ماہلی کے اعزاز 1995 میں) ہوئی تھی۔اس میں جے پور کے معروف شعرا موجود تھے۔ملکہ نسیم بھی شریکِ بزم تھیں۔دردؔ صاحب کبھی کبھار اپنے گھر پر بھی بزم آرائی کرتے،خاص طور پر مخمورؔ سعیدی اور مضطرؔ صدیقی کی جے پور آمد پر اس طرح کا اہتمام ہوتا تھا۔ان کے اولین شعری مجموعے ’’صبوحی‘‘ کی اشاعت کے موقع پر 19 جولائی 1997 کو جے پور (سوچنا کیندر) میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا۔اس میں مخمورؔ سعیدی،شین۔کاف نظامؔ، ممتازؔ شکیب،مضطرؔ صدیقی،شکور انور،فاروق انجینئر،شاہد ماہلی جی،ملکہ نسیم،انعام شررؔ،لطیف فہمی اور دوسرے مقامی شاعروں نے شرکت کی۔اس سے قبل کتاب کی اجرائی تقریب میں ڈاکٹر فیروز احمد صاحب اور راقم الحروف نے راجستھان کے جدید شعری ادب کے تناظر میں دردؔ ہوشیار پوری کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا۔

دردؔ ہوشیار پوری کی شعر گوئی کا سلسلہ چالیس برسوں کو محیط ہے۔انھوں نے یوں تو دوسری اصناف سخن مثلاً نظم،قطعہ،ماہیہ، ثلاثی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے تاہم وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر ہیں۔رسائل وجرائد میں ان کا کلام بہت کم شائع ہوا ہے کہ اس طرف ان کی توجہ نہیں رہی۔اپنے شعری سفر اور یہاں کے اساتذۂ سخن سے اثر پزیری کے متعلق دردؔ ہوشیار پوری لکھتے ہیں:

’’ملازمت کے سلسلے میں راجستھان کے مختلف اضلاع میں رہنے کا اتفاق ہوا۔چتوڑ گڑھ میں ماہر فن استاد شاعر جناب ساغر اجمیری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو اُن دنوں چتوڑ گڑھ کے قصبہ نیما ہیڑہ میں سکونت پزیر تھے۔موصوف گرامی کی صحبت انتہائی مفید ثابت ہوئی اور شعر و ادب میں واقعی دلچسپی کا آغاز ہوا۔بعدازاں بانسواڑہ پہنچا،قسمت نے میرا ساتھ یہاں بھی دیا اور اپنے ذوق کی تسکین کے اسباب فراہم کیے۔یعنی اردو کے کہنہ مشق اور زود گو شعراء جناب مضطر صدیقی اور جناب بسمل نقشبندی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ان حضرات کی قربت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔اور میرا شعور بیدار رہا۔‘‘(1)

دردؔ ہوشیار پوری نے شروع میں استاد شاعر ساغرؔ اجمیری (1911 تا1975) سے اصلاح لی،اُن سے درد صاحب نے کس قدر اثر قبول کیا،اس کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بانسواڑہ میں (1976 سے 1989 تک) اپنے (13/برس) قیام کے دوران دردؔ صاحب نے محمد عجب نور بسملؔ نقشبندی اور مضطرؔ صدیقی سے یقیناً گہرے اثرات قبول کیے ہیں کہ وہ دونوں شعرا کے ہم نوالہ وہم پیالہ رہے۔بسملؔ نقشبندی (متوفی: 4اکتوبر 2004) کلاسیکیت پسند شاعر تھے۔تصوف کے اثرات بھی ان کے یہاں نمایاں ہیں کہ وہ اس راہ کے سالک تھے۔ان کا مجموعۂ کلام ’’فاس انفاس‘‘(1996

میں) شائع ہوا۔ وہ شہر سے باہر اپنی خانقاہ میں رشد و ہدایت اور صدق وصفا کی بزم آرائی کے ساتھ ہی شعروادب کی محفلیں (مشاعرے) بھی سجائے ہوئے تھے، جس میں ملک کے معروف شعرائے کرام شریک ہوتے تھے۔ دردؔ ہوشیار پوری بھی بسملؔ نقشبندی کی شاعری کی متصوفانہ تعلیمات سے مستفیض ومتاثر ہوئے ہیں۔ جب کہ مضطرؔ صدیقی (متوفی 21 / جنوری 2009) بنیادی طور پر ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ دردؔ ہوشیار پوری تادمِ آخر ان سے قریب رہے۔ میرے خیال سے درد ہوشیار پوری مضطر صدیقی کے ترقی پسندانہ فکری تموج سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے کلام میں ان دونوں فکری رویوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر شاہدؔ میر اور ظفرؔ غوری نسبتاً جدید فکر و اسلوب کے شاعر تھے۔ ان کے تخلیقی فیضان و اثرات سے وہاں جدید شعری روایت قائم ہوئی۔ ان جدید شعرا کے بعض تلامذہ مثلاً: سعید روشن، ظہیر آتش وغیرہ بانسواڑہ میں شمعِ سخن کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ دونوں شعرا کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

دردؔ ہوشیار پوری کے کُل دو شعری مجموعے ''صبوحی'' (1997) اور ''سفالہ'' (2003) شائع ہوئے ہیں۔ دونوں مجموعوں میں یوں تو نظمیں، قطعات، گیت اور دوہے بھی شامل ہیں مگر ان کا بیشتر کلام غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ ''صبوحی'' میں 92 / اور ''سفالہ'' میں 57 / غزلیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور غزلیات بھی ہیں جو اُن کی بیاض میں ہیں۔ انتقال سے قبل دردؔ صاحب نے اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات مجھے (اودے پور) ارسال کی تھیں، ان میں غزلوں کے علاوہ متفرقات اور چند قطعات بھی شامل ہیں۔ یہ دردؔ ہوشیار پوری کا تازہ ترین کلام ہے۔ جس میں عصری زندگی کا عکس واثر نمایاں ہے۔ دردؔ ہوشیار پوری نے اپنے تصور شعر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ادب برائے زندگی کے نظریے کو میں نے ہمیشہ حق بجانب قرار دیا ہے۔ شعر میں مضمون کی ساخت کو عروض کی پابندیوں پر ترجیح دیتا ہوں ہمیشہ مترنم سہل ممتنع سے آراستہ صاف بحور میں طبع آزمائی کی ہے۔ پُر کارمگر سادہ الفاظ کے ذریعہ اپنے تجربات واحساسات کو اپنی نگارشات میں ضم کرنے کی کوشش کی ہے۔ صنائع وبدائع کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے رعایتِ لفظی کے استعمال کی بھی حتی الامکان کوشش کی ہے۔''(2)

دردؔ ہوشیار پوری کے نزدیک ''شاعری'' فی نفسہٖ تخلیق کار کے ذاتی و داخلی اظہار سے کہیں زیادہ خارجی واجتماعی فکرو احساس کی مظہر ہے۔ وہ شعر میں اپنے دل کے امل واضطراب سے زیادہ ذہن کے تفکرات کی نقش گری کے قائل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی شاعری میں ذاتی کرب وتعب کی بہ نسبت سماجی مسائل ومتعلقات کے اظہار کو اہمیت دی ہے۔ دردؔ صاحب نے متعدد غزلیہ اشعار میں بھی اپنے تصورِ شعر کی صراحت کی ہے مثلاً:

اگر زمین سے شاعر کا رابطہ ٹوٹے
تو پھر ردیف کو جوڑو تو قافیہ ٹوٹے

ازل سے شاعری پابندِ حق نوائی ہے
وہ دن نہ آئے جب ان کا معاہدہ ٹوٹے

کتنا ادب وطن کے لیے وقف کر دیا
میرا قلم سوال کرے گا ادیب سے

قبول کیوں نہ کروں درد وغم زمانے کے
ازل سے جبکہ مِلا دل ہی غمگسار مجھے

جناب دردؔ ہیں دردآشنا کچھ اس قدر یارو
کبھی ان سے کسی کی بےبسی دیکھی نہیں جاتی

زمانہ لاکھ میرے درد سے رہا غافل
مگر میں حالِ زمانہ سے بے خبر نہ رہا

قصرِغم، جوئے الم یاس کے محراب حسیں
کیسے خوش رنگ مناظر مرے باغات میں تھے

دنیا نئی، دنیا کے طلبگار نئے ہیں
جب نسل نئی ہے تو نئے شمس وقمر دے

پیش کردہ اشعار سے دردؔ ہوشیار پوری کے شعری جہات اور فکرو اسلوب کی کسی قدر سمت نمائی ہوتی ہے۔ دردؔ ہوشیار پوری نے اپنے احساسات وافکار کے بیان کے لیے کلاسیکی ڈکشن کے ساتھ ہی ساتھ جدید تشبیہات اور استعارات کا بھی استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں اپنے ترقی پسندانہ تصورات اور سماجی سروکاروں کے اظہار کے دوران انھوں نے ترقی پسند ڈکشن سے بھی عمدہ مصرف لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، دردؔ ہوشیار پوری شاعری میں ذات سے زیادہ سماج اور معاشرہ کے سروکاروں کو اہمیت تفویض کرتے ہیں، چنانچہ ان کے یہاں عوامی واجتماعی مسائل وحقائق کا بیان خصوصیت کے ساتھ ہُوا ہے۔ دردؔ کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ آزادی کی سات دہائیاں گزر جانے کے باوجود ملک میں لاکھوں کروڑوں لوگ ''جمہوریت'' کے کما حقہ، فیضانات وسہولیات سے محروم ہیں اور استحصالی اور جابر طاقتیں آج بھی ہمارے سماج میں موجود و مُتحرّک ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک صحت مند سماج کی تعمیر وترقی کے لیے ان مذمومات ومنہیات کا انسداد لازمی ہے۔ چنانچہ ایک باشعور تخلیق کار کو اپنے ذہن اور قلم کا تخلیقی مظاہرہ ناگزیر ہے۔ یہ اس کے ادبی منصب کا لازمہ ہے۔ دردؔ اپنے شعری اظہارات میں ملک ومعاشرے کے بنیادی مسائل پر غوروفکر کرتے ہیں۔ دردؔ کے حسب ذیل اشعار سے ان کے طریقِ فکر کا اندازہ ہوسکے گا۔

سوچوں تو دردؔ بحرِ مسلسل ہے زندگی
دیکھوں تو اک سراب کے اندر سراب ہے

پڑی ہیں جابجا سڑکوں پہ بےکفن لاشیں
شجر کے جسم سے چادر اتار دے کوئی

ڈھائے ہیں ستم وقت نے کچھ حد سے زیادہ
کہنے کو تو خوں ریزئ چنگیزی بہت ہے

گرائے حادثاتِ وقت نے جب قصرِ خوابوں کے
تو ہر دیوار کے اندر، مری خشتِ مکاں نکلی
ہر شخص کو دعویٰ ہے مسیحائی کا لیکن
بڑھتا ہی رہا دردِ جگر تیرے نگر میں
کسے الزام دیں تقدیر کو یا تیز دھاروں کو
لگا یا پار طوفاں نے، کنارے ہم کو لے ڈوبے
باغباں تجھ کو ہم آہنگیٔ گلشن کی قسم
اس کو بیگانۂ نغماتِ عنادل نہ بنا
شکستِ گل غمِ سنبل کہیں پر نالۂ بلبل
یقیناً دید کے قابل نہیں حالت گلستاں کی
موسم کو سیاست نے بنایا ہے لہو رنگ
اس کو کوئی قدرت کا کرشمہ نہ سمجھ لے
اپنے تاریک گھروندوں کا خیال آتا ہے
دیکھتے ہیں جو کبھی نور کے منظر ہم لوگ
نئے موسم نئے گل چیں نئے ظلم و ستم دیکھے
نویدِ فصلِ گل بن کر جدھر ڈالی نظر میں نے
مرے ملک کا مقدر یہی مستقل غریبی
ہے یہی نمودِ منزل ہے یہی نشانِ جادہ
وقت اس ناپاک سازش کو نہ بخشے گا کبھی
آج ہر چہرے پہ جو نفرت کا غازہ مَل گئی
کھلونا ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی جہاں ٹوٹے
وہیں ہے خونِ حسرت کا وہیں ہے موت ارماں کی
انسانیت کی لاش ہے کب سے ٹنگی ہوئی
آ کر اُسے کوئی تو اتارے صلیب سے

محولہ بالا اشعار کے طرزِ فکر و اظہار کے علاوہ دردؔ ہوشیارپوری کی غزل میں یک گونہ داخلی و انفرادی طرزِ احساس بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے، اس نوعیت کے تخلیق پاروں میں شاعر کے نہاں خانۂ وجود کے نفسیاتی ارتسامات کا انکشاف ہوتا ہے۔ دردؔ کے داخلیت آمیز شعری پیکروں میں شاعر کی کائناتِ دل کے اسرار کھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں قاری کی ذہنی مشارکت و مماثلت کے بھی پہلو نکلتے ہیں۔ لہٰذا درج ذیل شعری نمونے جدید غزل سے کسی قدر ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں:

وہ میری روح کی گہرائیوں میں پنہاں ہے
غلط ہے یہ کہ میں اس کو بھلائے بیٹھا ہوں
لکھ لکھ کے جس نے چاہا مٹاتا رہا ہمیں
ہم عمر بھر اک حرفِ مکرّر بنے رہے
ہے نقش بہ دیوار ترے ہجر کا منظر
تو اس میں کبھی وصل کے کچھ رنگ تو بھر دے
پتھر کے پگھلنے میں ذرا وقت لگے گا
گو جسم میں سانسوں کی تپش تیز بہت ہے
جاتی تو کہاں جاتی مجھے چھوڑ کے اے دردؔ
جز میرے، شبِ غم کا پرستار نہ تھا اور
اپنے کردار کو ہر چند سنبھالے رکھا
میں نے گرتی ہوئی دیوار کو گرنے نہ دیا
جو ملا ہے کسی ہمدرد کی ہمدردی سے
دردؔ اس درد کا مشکل سے مداوا ہوگا

دردؔ ہوشیارپوری کا سلسلۂ سخن تادمِ آخر جاری رہا ان کے غیر مطبوعہ کلام کی بھی اشاعت ہونی چاہیے۔ مگر اب اس کی امید ذرا کم ہے۔ مضطرؔ صدیقی نے بھی اپنا آخری مجموعۂ کلام ’سائبان‘ کے نام سے ترتیب دے رکھا تھا جس پر قمر رئیس صاحب کا مقدمہ شامل ہے مگر شائع نہ ہوسکا۔ مضطرؔ حیات ہوتے تو اس کا امکان تھا۔ مضطرؔ صدیقی سے ان کی دوستی کا سلسلہ تقریباً چار دہائیوں تک قائم رہا۔ مرتے دم تک وہ ایک دوسرے کے یارِ غار ہی رہے۔ ایسے وفادار اور مخلص دوست میری نظر سے کم ہی گزرے ہیں۔ مضطرؔ صدیقی اپنے چھوٹے بیٹے محمد وصی صدیقی کے یہاں جے پور آئے ہوئے تھے۔ انتقال سے ایک روز قبل جے پور کے پرتاپ آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک ادبی پروگرام میں میری اُن دونوں بزرگوں سے ملاقات ہوئی تھی، جس میں ممبئی سے گلزار صاحب اور راجستھان سے شین۔کاف نظام شامل تھے۔ رات کو مشاعرے کے بعد مضطرؔ صدیقی دردؔ صاحب کے ساتھ ہی چلے گئے۔ دوسرے دن دردؔ صاحب کے مکان پر ہی مضطر صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور وہ اپنے ہم دمِ دیرینہ سے بات کرتے ہوئے 21 جنوری 2009 کو ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ مضطرؔ صدیقی جب بھی اپنے بیٹے وصی صدیقی کے یہاں آتے، چند روز دردؔ ہوشیارپوری کے یہاں بھی قیام کرتے تھے۔ وہیں سے ایک ساتھ آکاش وانی، اردو اکادمی اور TV سینٹر جاتے۔ شہر کے سینئر شعرا مثلاً: کیفی ایوبی، ہوشؔ سرحدی، عشرتؔ دھول پوری اور دردؔ اکبرآبادی وغیرہ سے بھی ملاقات کرتے۔ راقم الحروف کو بھی وہ اپنے ساتھ لے لیا کرتے تھے۔ مضطرؔ صاحب کے بیٹے وصی صدیقی (پ: یکم اکتوبر 1973۔م: 20 جون 2021) میرے دوستوں میں تھے۔ انھوں نے جے پور سے اپنی آخری تعلیمی سند (M.C.R.2001) لی۔ وہ یہیں کسی کمپنی میں Job کرتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد وصی بھی شعر کہنے لگے تھے۔ آکاشوانی جے پور کے اکثر پروگراموں میں ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ افسوس کہ 20 مئی 2021 میں کورونا (Corona) کال (بانسواڑہ) میں وہ بھی انتقال کرگئے۔

ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

دردؔ صاحب مضطر صدیقی کی دائمی جدائی میں ملول رہتے تھے۔ ان کے انتقال سے تقریباً ایک سال قبل، میں اور نذیر فتحوری (مدیر: اسباق پونہ) ان سے گھر پر (مان سرور میں) ملاقات کو گئے تھے، اس وقت انھوں نے ہمیں اپنا تازہ کلام سنایا۔ کچھ قطعات مضطر صاحب نے (اظہارِ غم) کے متعلق بھی کہے تھے۔ تعزیتی اشعار سناتے ہوئے وہ کئی بار آبدیدہ ہوئے۔ سچ یہ ہے کہ مضطرؔ صدیقی کے بعد دردؔ صاحب اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں واقعی اکیلا محسوس کرنے لگے تھے۔ دردؔ پنجابی تھے، تھوڑی بہت شراب ان کے یہاں پہلے سے روا تھی، مضطرؔ صدیقی کے غم مفارقت سے مے کشی میں شاید اضافہ ہوگیا، جس سے ان کا Liver متاثر ہوا اور Hapatitis کے عارضے میں مبتلا ہوکر کچھ دنوں کی علالت کے بعد یکم مارچ 2012 کو وہ خود بھی اس دنیا سے کوچ کر

گئے۔ ویسے ان کے حلقۂ احباب میں دوسرے شعراء مثلاً: عشرت دھول پوری، فاروق انجینئر، مدان ہوشؔ سرحدی بھی تھے مگر (ایسا کہاں سے لائیں کہ مضطر کہیں جسے) مضطرؔ سے دردؔ کا تعلقِ خاطر شاعرانہ ہی نہیں، دوستانہ بھی تھا، برادرانہ بھی۔ اکثر بھائیوں اور خاص کر شاعروں میں اختلاف ہونا عام بات رہی ہے۔ مگر دردؔ اور مضطرؔ کی رفاقت واقعتاً قابلِ رشک تھی۔ میں خود پندرہ برسوں تک اُن کی بے ریا و بےلوث آشنائی کا عینی شاہد رہا ہوں۔ مضطرؔ صدیقی سے ایم۔فل (1993) کے دوران بذریعۂ مراسلت رسم و راہ قائم ہوئی، ان کے توسط سے دردؔ ہوشیار پوری سے شناسائی ہوئی۔ دونوں بزرگ اکثر میرے یونیورسٹی ہاسٹل (D.B.N.) اور پھر Teacher Hostel میں برابر تشریف لاتے رہے۔ یہ دراصل ان کی خُردنوازی تھی ورنہ میری عمر کی تو اُن کی اولاد ہے۔ اب ایسے سادہ و مخلص ادیب عنقا ہیں؟

اب ان کو دیکھنے کو بھی آنکھیں ترستی ہیں
دل سے دعائیں دیتے تھے جو دل نشین لوگ

حوالہ جات:

1۔ اپنی بات۔:''صبوحی'۔ص:12۔ دردؔ ہوشیار پوری۔1997

2۔ صبوحی۔ص:12

❑❑❑

تخلیق کاروں سے گذارش

اپنی تخلیقات/نگارشات صفحہ کے ایک طرف ہی لکھیں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔

ای۔میل سے بھیجی ہوئی تخلیقات/نگارشات کی ہارڈ کاپی جس پر آپ کا پتہ اور موبائل نمبر صاف صاف درج ہو، بھیجنے کی زحمت کریں۔

جو تخلیقات کسی وجہ سے شائع نہیں ہوں گی، ان کی واپسی کے لئے اکادمی ذمہ دار نہیں ہوگی۔

تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ ایف۔ ایس۔ سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

اترپردیش اردو اکادمی بچوں کے مزاج و معیار کے لحاظ سے

ماہنامہ باغیچہ

پورے آب و تاب کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔ اس کے فروغ اور توسیع کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے۔

۱۔ آپ اپنی تخلیقات بھیج کر
۲۔ خود خریدار بن کر اور دوسروں کو ترغیب دے کر
۳۔ بچوں میں اردو رسائل پڑھنے کا ذوق بیدار کر کے

اردو کی خدمت کر سکتے ہیں۔

عمر شریف مہوی
اکبر نگر، لکھنؤ-Mob.9651904763

غزل

قصہ حیات و موت کا کوئی نیا نہیں
کب کس سے کون بچھڑے کسی کو پتہ نہیں

حالاتِ حاضرہ سے بھی واقف ہیں ہم مگر
ماضی سے مت سمجھنا کہ ہم آشنا نہیں

سارا قصور ہے مری فکر معاش کا
انسان فطرتاً تو کبھی ٹوٹتا نہیں

پھولوں کی طرح کاٹی ہے گلشن میں زندگی
صحرا کی تلخیوں کا مجھے کچھ پتہ نہیں

قدآوروں میں بونے بھی ہونے لگے شریک
کیا پستیٔ شعور کی یہ انتہا نہیں

دنیا جِلا کی فکر کرے بھی تو کیا کرے
محتاجِ رنگ و نور مرا آئنہ نہیں

مانا کے بدمزاج ہوں فطرت سے میں شریفؔ
خود فہم و خود فریب نہیں، خود نما نہیں

●●●

سلیم تابشؔ
مولوی گنج، لکھنؤ-Mob.7800114696

غزل

کوئی ساقی سے کہے اور نہ ترسائے ہمیں
اس کی محفل میں بڑی دیر ہوئی آئے ہمیں

فلسفہ عشق کا آسان سمجھ رکھا ہے
گر کوئی سمجھا ہو آکر ذرا سمجھائے ہمیں

اپنے ماضی کی طرف مڑ کے بھلا کیا دیکھیں
ہم کو اچھا نہیں لگتا کوئی دہرائے ہمیں

زندگی تجھ کو بہت ٹھیک سے پہچان گئے
وقت نے تیرے کئی روپ ہیں دکھلائے ہمیں

ہر کوئی اپنی ہی اُلجھن میں یہاں اُلجھا ہے
کس کو فرصت ہے کہ آکر کوئی سلجھائے ہمیں

زہر آلود تعصب کی ہواؤں کے سبب
آج گلشن میں سبھی گل ملے مرجھائے ہمیں

ایک وہ شخص جو ہمدم ہے ہمارا تابشؔ
اس کی خواہش ہے لہو سے کبھی نہلائے ہمیں

●●●

سمیع الدین خاں شاداب
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
ہندو کالج، مرادآباد-Mob.9358386884

صوفی امبا پرساد: آزادی کا شعلۂ جوالہ

آزادی ایک ایسی نعمت ہے جس کا تعلق بہت سی نعمتوں سے ہے۔ براہ راست یا بالواسطہ طور سے انسانی سماج کی تمام تر ترقی آزادی کی مرہون منت ہے۔اس کا زندہ ثبوت مجاہدین آزادی کی وہ بے لوث قربانیاں ہیں جس میں آزادی کے لیے انھوں نے ہنستے ہنستے اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں جو جنگ لڑی گئی اس میں انگریزوں کی فتح نے یہ طے کر دیا کہ مستقبل میں ہندوستان کا حکمراں کون ہوگا؟ اس فتح کے بعد ہی انگریزوں نے اپنے دائرۂ اقتدار کو وسعت دیتے ہوئے ملک کے اقتصادی نظام پر پوری طرح سے قابو حاصل کر لیا۔ اقتصادی نظام پر قابو پانے کے بعد جب انھوں نے ہندوستان کے معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی روایتی اور حد یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی تو عوام میں ان کے خلاف نفرت اور بغاوت کی آگ سلگنے لگی۔ یہی سلگتی ہوئی آگ ۱۸۵۷ء میں ایک دہکتا ہوا شعلہ ب گئی۔ حالانکہ انگریزوں نے اپنے تمام وسائل اور طاقت و توانائی کا استعمال کرتے ہوئے اس بغاوت کو پوری طرح کچل دیا۔

عموماً ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ بغاوت ناکام رہی لیکن سچائی یہ ہے کہ یہ ہندوستانیوں کے حوصلوں اور آزادی کے ولولوں کی شکست نہیں تھی بلکہ یہیں سے ایک نئی تحریک آزادی نے جنم لیا اس جنگ آزادی میں روایتی ہتھیاروں کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ معاشرے کا ہر طبقہ اپنے طور طریقوں سے اس جنگ کا حصہ دار بن گیا۔ ادیب اور شاعر اپنے قلم سے، مصور اپنے رنگ اور برش سے، مقرر اپنی تقریروں سے اور صحافی اپنے اخبارات، رسائل اور جرائد سے اس تحریک آزادی کا حصہ بن رہے تھے۔

جس وقت یہ پہلی جنگ آزادی اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ عین ان ہی دنوں ۱۸۵۸ء میں اتر پردیش (اس وقت اس کا نام (North western Provinces N.W.P.) تھا) کے مرادآباد شہر کے محلّہ قانون گویان میں ایک بھٹناگر کائستھ خاندان میں گوبند پرساد بھٹناگر کے گھر ایک بچے کی پیدائش ہوئی جس کا نام امبا پرساد بھٹناگر رکھا گیا۔ یہی بچہ بڑا ہو کر انگریزی سرکار کی ناک میں دم کرنے والا مجاہد آزادی بنا۔

پیدائش کے وقت سے ہی امبا پرساد کا دایاں ہاتھ نہیں تھا لیکن یہ جسمانی کمزوری کبھی بھی ان کے عظیم

کارناموں میں رکاوٹ نہیں بنی بلکہ وہ تو فخریہ انداز میں کہا کرتے تھے:

''پچھلے جنم میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے میرا ایک ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اس جنم میں جس کی شروعات ۱۸۵۸ء سے ہوئی اس بچے ہوئے ہاتھ کو قلم کی طاقت سے مضبوط کر کے میں انگریزوں سے جنگ جاری رکھے ہوئے ہوں۔''

امبا پرساد کے آبا و اجداد اگوان پور مراد آباد کے باشندے تھے۔ان کے دادا کانجی مل بھٹناگر نے مراد آباد کے شہری علاقے میں زمین خرید کر اپنا ذاتی مکان بنوایا تھا۔کانجی مل کے دو بیٹے تھے۔گوبند پرساد اور درگا پرساد۔ درگا پرساد کے امبا پرساد سمیت سات بیٹے ہوئے۔

امبا پرساد نے بریلی کالج بریلی سے گریجویشن کیا اور جالندھر سے وکالت پاس کی۔ یونانی اور آیورویدک طریقۂ علاج میں بھی ماہر تھے۔اس کے علاوہ مسمریزم، نجوم اور علم قیافہ کی اچھی خاصی معلومات تھی۔ دیسی ٹونے ٹوٹکوں میں بھی مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے علم مسمیریزم اور علم قیافہ موضوعات پر ''جام جم'' نام کی کتاب لکھی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

امبا پرساد کی شادی بریلی سے ہوئی تھی لیکن ان کی ازدواجی زندگی زیادہ دن نہ چل سکی۔شادی کے ڈھائی سال بعد ہی ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔اس حادثے کے بعد امبا پرساد کا دل دنیا سے اچاٹ ہوگیا۔اسی درمیان ان کا رابطہ مجاہد آزادی سید محبوب حسین کے دادا سید محمد حسین سے ہوا اور ان کا رجحان صوفیت کی طرف ہوگیا اور یہیں سے ان کے نام کے ساتھ صوفی لفظ بطور سابقہ جڑ گیا اور ان کو 'صوفی امبا پرساد' کہا جانے لگا۔محلّہ قانون گویان میں ہی صوفی امبا پرساد نے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔ یہ چھاپہ خانہ انھوں نے اپنے آبائی گھر پر ہی لگایا تھا اس لیے پورے علاقے میں یہ گھر 'چھاپے خانے والا گھر' کے نام سے مشہور ہوگیا۔

۱۸۸۴ء میں صوفی امبا پرساد نے ایک ماہنامہ 'جامع العلوم'' نکالنا شروع کیا۔سولہ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ 'سدرشن پریس' سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے مدیر صوفی امبا پرساد، مالک سوامی منشی نارائن داس اور منتظم پرمیشوری داس تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۹۶ء میں ہفت روزہ ہوگیا۔سولہ صفحات کا یہ ہفت روزہ رسالہ ''آتم پرکاش' پریس سے شائع ہوتا تھا۔ 'آتم پرکاش پریس، سے شائع ہوتا تھا۔ 'آتم پرکاش' پریس صوفی امبا پرساد کا ہی تھا۔اس رسالہ میں روحانی موضوعات پر مضامین ہوتے تھے اس کے علاوہ سیاسی، سماجی ،تہذیبی اور ثقافتی اور طبی مضامین شائع ہوتے تھے۔مضامین کی زبان مفرس اور خالص ادبی اردو ہوا کرتی تھی۔ صوفی امبا پرساد انگریزی حکومت کے خلاف بہت کھل کر لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۸۹۰ء میں کلکتے (موجودہ کولکاتا) سے شائع ہونے والے ''امرت بازار پتریکا'' اخبار کے لیے نامہ نگار صحافی کے طور پر بھی کام کیا۔اس اخبار کے مدیر ششر کمار گھوش تھے۔ اور اس اخبار نے 'سودیشی تحریک' کی کافی ترویج و اشاعت کی۔ ۱۸۹۷ء میں صوفی امبا پرساد کو باغیانہ مضامین لکھنے کے الزام میں مراد آباد کی عدالت نے قید کی سزا

سنائی۔ان کا چھاپہ خانہ اور چھاپے خانے والا گھر بھی ضبط کرلیا گیا۔اٹھارہ ماہ کی قید کے بعد رہا ہونے پر انھوں نے دوبارہ انگریز ریزیڈنٹوں کے کالے کارناموں کی پول کھولنا شروع کر دی۔ان کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور ایک بار پھر قید کی سزا ہوئی قید خانے میں ان پر کافی مظالم کیے گئے۔

ایک بار جیلر نے ان سے بڑے طنز آمیز لہجے میں کہا ''تم مرے نہیں''، تو انھوں نے برجستہ بہت بے خوفی سے جواب دیا۔''جناب آپ کے راج کا جنازہ اٹھائے بغیر میں کیسے مر سکتا ہوں۔''

قید کی سزا پوری کرنے کے بعد صوفی امبا پرساد جب قید خانے سے باہر آئے تو انھوں نے مراد آباد چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ پہلے حیدر آباد گئے لیکن کچھ دنوں بعد ہی وہ لاہور چلے گئے۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی تحریک آزادی پنجاب، بنگال، مہاراشٹر میں اپنی پوری قوت اور توانائی سے ابھر رہی تھی۔۱۹۰۵ء میں جب 'تقسیم بنگال' کا واقعہ پیش آیا تو بنگال میں سلگ رہی تحریک آزادی کی آگ بھڑک کر شعلہ بن گئی اور اس نے پورے ملک کے مختلف حصوں میں چل رہی تحریکوں کو تیز تر کر دیا۔

سرزمین پنجاب سے بھی کئی بے خوف اور باحوصلہ صحافی اس میدان میں اُتر آئے اور اپنے اخباروں کے اداریوں، پوسٹروں، پمفلٹوں اور فولڈروں کے ذریعے پورے ہندوستان میں تحریک آزادی کی مشعل کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے میں جی جان سے جٹ گئے۔

انہی دنوں پنجاب کے انقلابیوں نے ۱۹۰۷ء میں ایک انجمن بنائی اس کا نام تھا'' بھارت ماتا سوسائٹی''۔صوفی امبا پرساد جب لاہور پہنچے تو وہ بھی اِسی انجمن میں شامل ہو گئے اس سوسائٹی کے ممبران میں سردار اجیت سنگھ، سردار بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ، ہفت روزہ '' آفتاب'' کے مدیر سید حیدر رضا، اردو ہفت روزہ 'ویکلی انڈیا' کے ایڈیٹر لالہ پنڈی داس، 'پیشوا' لاہور کے مدیر ضیاء الحق، 'دی پنجاب' کے ایڈیٹر لالہ جسونت سنگھ جیسی عظیم انقلابی شخصیتیں بھی تھیں۔سوسائٹی کے ابلاغی فرائض صوفی امبا پرساد کو سونپے گئے۔انجمن کے جلسوں میں بھی وہ اپنی شعلہ بیان تقاریر کے لیے مشہور ہو گئے تھے۔ بھارت ماتا سوسائٹی نے برطانوی حکومت کے خلاف لکھے لٹریچر کی اشاعت کے لیے بھارت ماتا ایجنسی قائم کی تھی۔ صوفی امبا پرساد کی کتاب 'دیسی فوج، ظفر موج' بھی اسی ایجنسی کے ذریعے فروخت کی جارہی تھی۔ بھارت ماتا سوسائٹی نے بنگال کی کئی انقلابی جماعتوں سے بھی رابطہ قائم کرلیا تھا۔

۱۹۰۷ء میں پنجاب سے 'پگڑی سنبھال جٹا' تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ ایک کسان تحریک تھی جس نے بعد میں شدید بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ انگریز حکمراں اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں یہ تحریک ۱۸۵۷ء جیسے حالات پیدا نہ کردے۔ لاہور کی پریسوں اور اشاعتی اداروں پر چھاپے مارے جانے لگے۔سردار کشن سنگھ اور لالہ کرم چند کی 'قومی بک ایجنسی' لالہ لال چند فلکؔ کی 'وندے ماترم'

بک ایجنسی اور ہندوستان اسٹیمر پریس پر چھاپے مارے گئے تو وہاں سے صوفی امبا پرساد کی تحریر کردہ کئی کتب ’دیسی فوج ظفر موج، یورپی تہذیب کی بے ضابطگیاں، باغی اسپیچ، لیکچرز تلک وغیرہ برآمد ہوئیں جن کو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ سرکار کے خلاف اس طرح کا لٹریچر لکھنے اور اس کو عوام میں تقسیم کر کے ان پر بغاوت پھیلانے کے الزام میں سردار اجیت سنگھ اور صوفی امبا پرساد پر مقدمات قائم کیے گئے۔ اسی دوران ضیاء الحق کو بھی ایران سے گرفتار کیا گیا۔ سردار اجیت سنگھ کو لائل پور سے گرفتار کیا گیا۔ ان گرفتاریوں اور پابندیوں کی وجہ سے بھارت ماتا سوسائٹی تقریباً ختم ہو گئی۔لیکن اس سوسائٹی نے پنجاب، مہاراشٹر، بنگال، دہلی اور ملک کے مختلف حصوں میں انقلابیوں کو ایک بڑا پلیٹ فارم مہیا کر کے ان کو منظّم کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اس سے آزادی کے لیے عوام میں خصوصاً نوجوان طبقے میں نیا جوش اور ولولہ بھر گیا۔ صوفی امبا پرساد نے پنجاب پہنچ کر جہاں انقلابیوں کے مختلف گروہوں میں نیا جوش پیدا کر دیا وہیں انہوں نے صحافت کے اس کام کو جسے وہ مراد آباد سے اپنے ساتھ لائے تھے ایک نیا انقلابی روپ دے دیا۔ انہوں نے بھارت ماتا سوسائی کی معاون تنظیم (جو کانگریس کے انتہا پسندوں کی حمایت کرتی تھی) ’ہندوستان‘ کے کئی اخبارات میں مدیر کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔ صوفی امبا پرساد نے پنجاب سے شائع ہونے والے لالہ دینا ناتھ کے اخبار ’انڈیا‘ کی ادارت بھی کی۔ اپنی اشاعت کے صرف دو ماہ بعد ہی اس اخبار کے مالک لالہ دنیا ناتھ کو سزا ہو گئی تھی اس کے پہلے مدیر پنڈی داس کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ دونوں کو پانچ پانچ برس کی قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ اس عرصے میں اس اخبار کی ادارت کا کام صوفی امبا پرساد نے ہی سنبھالا۔

صوفی امبا پرساد بھی سرکار کی نظر میں مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل تھے لیکن وہ اپنی سمجھ داری سے سرکار کی نظروں سے بچتے بچاتے نیپال چلے گئے۔ لیکن اُن کو نیپال کی سرحد سے گرفتار کر کے لاہور لایا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا مقدمے میں صوفی امبا پرساد پر لگائے گئے الزامات ثابت نہ ہو سکے اور بالآخر ان کو بری کر دیا گیا۔

اخبار ’انڈیا‘ بند ہو جانے کے باعث صوفی امبا پرساد نے ہفت روزہ ’ہندوستان‘ کی ادارت سنبھالی۔ امبا پرساد کے عرصۂ ادارت میں اس اخبار کی تعداد اشاعت 15000 تک پہنچ گئی۔ اُس دور میں کسی اخبار کی یہ تعداد ایک بڑا کارنامہ تصور کی جاتی تھی۔

انگریزوں کی استبدادی اور جابرانہ پالیسیوں نے بھارت ماتا سوسائٹی اور پگڑی سنبھال جٹّا جیسی تحریکوں کو بری طرح کچل دیا۔ لیکن جذبۂ حریت کو تو نہیں کچلا جا سکتا بلکہ اس کو تو جتنا زیادہ کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ اُتنا ہی شدید ہو کر ابھرتا ہے۔

جب اپنے ہی وطن کی سرزمین سے وطن کو آزاد کرنے کی تحریکوں کو چلانا مشکل ہو گیا تو آزادی کے متوالوں نے دیار غیر کا رخ کیا اور دیگر ممالک سے علم انقلاب بلند کیا۔ سوہن اور

بھکنا، کرتار سنگھ سرابا، بھائی پر مانند، لالہ ہردیال، بابا پرتھوی سنگھ آزاد نے امریکہ میں 'ہندی ایسوسی ایشین' نام کی انجمن قائم کی جو بعد کو 'غدر پارٹی' بن کر ابھری۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں ہندوستانی بسے ہوئے تھے وہاں 'غدر پارٹی' کی شاخیں قائم کی گئیں۔

صوفی امبا پرساد، سردار اجیت سنگھ، رشی کیش لیتھا، ٹھا کر داس اور ضیاء الحق جیسے انقلابیوں نے بھی سرزمین پنجاب سے وطن پر جان نثار کرنے کے خواہش مند سرفروشوں کی بھرتی شروع کر دی۔ صوفی امبا پرساد بیرون ملک سے تحریک آزادی چلانے کے لیے ایران چلے گئے اور ضیاء الحق ترکی چلے گئے۔ صوفی امبا پرساد کے ایران جانے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو فارسی زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے پر عبور حاصل تھا۔ صوفی امبا پرساد نے ایران میں تلک آشرم بھی قائم کیا۔ ایران جا کر انہوں نے وہاں کی قومی تحریک میں حصہ لیا اور وہاں پر عوام میں جذبۂ بغاوت کو بڑھانے میں لگے رہے۔ ۱۹۱۰ء تک ان انقلابیوں کی سرگرمیاں اور ان کی انجمن ''حیات'' انگریزی سرکار کی نظر میں آ گئی اور اس پر نہایت سرعت سے قابو کر لیا گیا۔

صوفی امبا پرساد وہاں کے انقلابیوں سے بہ آسانی رابطہ قائم لیتے تھے کیونکہ ان کو فارسی زبان بولنے میں مہارت حاصل تھی اور اُن کو ایرانی تہذیب اور وہاں کے عوامی رویوں سے پہلے سے ہی واقفیت تھی۔ ایرانی عوام کو انہوں نے انگریزوں کی استحصال اور استبداد کی پالیسی سے ہوشیار کیا۔ وہاں کی عوام میں بھی وہ صوفی کے طور پر ہی پہچان بنائے ہوئے تھے ایران میں انہوں نے ''آبِ حیات'' نام کا اخبار بھی نکالا۔ صوفی امبا پرساد ایران میں بھی برٹش سامراج کے خلاف انقلابیوں کی فوج تیار کرنے میں لگے رہے۔

پہلی عالمی جنگ شروع ہونے پر صوفی امبا پرساد 'انڈو جرمن سازش' (Indo German Conspiracy) میں شامل ہو گئے۔ اس سازش میں ہندوستانی انقلابیوں نے امریکہ، جرمنی اور ہندوستانی کارکنوں کو شامل کر لیا۔ (Irish Republicans) اور جرمن وزارت خارجہ کے علاوہ Ottoman Turkey کی حمایت بھی ہندوستانی انقلابیوں کو حاصل تھی۔ اس سازش کا مقصد پنجاب سے سنگا پور تک پورے علاقے میں ہند۔ برٹش افواج میں بغاوت پھیلا کر ہندوستان سے انگریزی حکومت کی جڑیں اکھاڑنا تھا۔ صوفی امبا پرساد اس تحریک میں مہندر پرتاپ اور لالہ ہردیال کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے اور انہوں نے مشرق وسطیٰ کے ممالک اور عراق وغیرہ میں موجود ہندوستانی افواج کے سپاہیوں میں انقلابی خیالات کی کافی ترسیل و تبلیغ بھی کی۔ صوفی امبا پرساد اور ان کے ساتھیوں کا ارادہ یہ تھا کہ ہند ایران مغربی سرحد سے انقلابی فوجیوں کو داخل کر دیا جائے اور ہندوستانی افواج کو بلوچستان اور پنجاب میں منظّم کیا جائے۔ اس کوشش میں امبا پرساد کے ساتھ کیدار ناتھ سوندھی، رشی کیش لیتھا اور امین چودھری خاص طور سے شامل تھے۔ اس گروپ میں ایرانی اور بلوچی قبائل بھی شامل تھے جن کو جرمنوں سے حمایت حاصل ہو رہی تھی۔ اس انقلابی جماعت نے سرحدی شہر کرمان کو اپنے قبضے میں لے لیا اور وہاں کی British Commercial Ambessy

پر قبضہ کرلیا۔ اب تک افغانستان، بلوچستان اور کشمیر کے بہت سے علاقوں میں بغاوت کی آگ بھڑک چکی تھی۔ اس کے بعد یہ انقلابی باغی کراچی کی طرف بڑھنے لگے۔ برطانوی حکومت سے اپنی آزادی کا اعلان کرنے والے بلوچی حریت پسندوں نے بھی ان انقلابیوں کا ساتھ دیا۔

جن مقامات پر بھی یہ بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں انگریز حکومت اپنی پوری قوت سے ان کو کچل رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بغاوت کو دبانے کی غرض سے اتنے بڑے پیمانے پر اتنی سخت جارحانہ تادیبی کارروائی پہلی بار کی جارہی تھی۔

تادیبی کارروائیوں کے اسی سلسلے میں حالات پر قابو پانے کے لیے 1907ء کا The Prevention of Saditions meeting Act اور دھماکہ خیز آتشی اشیاء سے متعلق قانون Explosive Substance Act، ہندوستانی فوجداری کا ترمیم شدہ قانون، جرائم کو بڑھاوا دینے کے خلاف اخبارات کا قانون ۱۹۰۸ء اور اخبارات کا قانون ۱۹۱۰ء اور اسی قسم کے مختلف چھوٹے چھوٹے قوانین کو ملا کر ۱۹۱۵ء کا Defence of Indian rules بنایا گیا۔ اس قانون کا اصل مقصد 'غدر پارٹی' کو ختم کرنا تھا۔ پنجاب اور بنگال میں بڑی تعداد میں لوگوں کو محض شبہ کی بنیاد پر بغیر مقدمہ چلائے برسوں تک قید میں رکھا گیا۔ مخصوص عدالتیں بنائی گئیں جو انتہائی وحشیانہ سزائیں دے رہی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان عدالتوں نے 'غدر پارٹی' سے متعلق لوگوں میں سے ۴۶، افراد کو سزائے موت اور ۶۴، افراد کو تاعمر قید کی سزا دی۔ اس کے علاوہ ایک خاصی بڑی تعداد میں فوجیوں کا کورٹ مارشل بھی کیا گیا۔ ادھر انقلابیوں کو کچلنے کی تمام ترا کیب کی جارہی تھیں تو دوسری طرف ایران کے شہر شیراز میں انقلابی دوبارہ اکٹھا ہونے لگے۔ صوفی امبا پرساد بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر برطانوی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ لیکن افسوس! وہ پوری طرح اپنے دل کے ارمان نہ نکال سکے۔ انگریز فوج نے ان کو گرفتار کرلیا۔ ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت سنائی گئی۔ ان کو گولی مارنے کا حکم دیا گیا۔

جس دن ان کو سزا دی جانے والی تھی اس دن صبح کو جب جیل کی کوٹھری کھولی گئی تو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ وہاں صرف ان کا جسد خاکی رہ گیا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس عظیم صوفی نے اپنی 'یوگ سادھنا' سے اپنی روح کو اپنے جسم سے علیحدہ کردیا۔ ان کی آخری رسومات شیراز میں ہی ادا کی گئیں۔ اُن کی سمادھی پر لکھا ہے۔

''محبِّ وطن ہندوستانی آقا صوفی''

اس عظیم مجاہد آزادی کی شہادت کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے یوم وفات میں کافی اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے ۱۹/جنوری ۱۹۱۹ء لکھا ہے تو کچھ ۱۹۱۷ء بتاتے ہیں کچھ جگہوں پر اس کو فروری 1915ء بھی درج کیا گیا ہے۔

صوفی امبا پرساد نے جس بے خوفی، حوصلہ مندی اور دانش مندی سے غیر ملکی حکومت کے ظلم و جبر کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی آخری سانس تک آزادی کے لیے تمام کوششیں

جاری رکھیں اس سے ملک کے ہر کونے میں چل رہی انقلابی تحریکوں کی راہیں ہموار ہوئیں اور مجاہدین آزادی کو ہمت و حوصلہ حاصل ہوا۔ اس عظیم قربانی سے ترغیب پا کر تحریک آزادی کی راہ پر گامزن بے شمار آزادی کے پروانوں نے ہنستے ہنستے اپنی انمول جانیں قربان کر دیں۔

آج ہم جس آزاد ملک میں سانسیں لے رہے ہیں اس کی آزادی صرف امبا پرساد اوران کی طرح کے بہت سے عظیم شہیدوں کا عطا کردہ تحفہ ہے اب یہ تمہارا فرض ہے کہ ہم آزادی کی اس عظیم نعمت کی بہ ہر صورت حفاظت کریں۔

استفادہ

۱۔تاریخ صحافت اردو (جلد سوم) از امداد صابری ۱۹۶۲ء

۲۔صوفی امبا پرشاد مراد آبادی اور شہیدان وطن از امداد صابری ۱۹۷۶ء

۳۔شہیدان آزادی (جلد اول) ڈاکٹر پی۔ این چوپڑا (چیف ایڈیٹر) دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء

۴۔انقلاب اٹھارہ سوستاون از پی۔سی جوشی تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء

۵۔اردو صحافت میں مراد آباد کا حصہ از ڈاکٹر انور حسین اسرائیلی ۲۰۱۰ء

۶۔ماہنامہ نیا دور لکھنؤ شمارے اگست ۱۹۹۷ء، مئی ۲۰۰۷ء، جنوری ۲۰۱۵ء

۷۔جامع اردو انسائیکلو پیڈیا جلد ۲۰ تاریخ....... پروجیکٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ۲۰۰۰ء

معید رہبرؔ

سعادت گنج، لکھنؤ-Mob.9889371674

پندرہ اگست

سب کو گلے لگاؤ کہ ہے پندرہ اگست
پھر دل سے دل ملاؤ کہ ہے پندرہ اگست

آپس میں بھید بھاؤ سے حاصل نہ ہوگا کچھ
نفرت کو بھول جاؤ کہ ہے پندرہ اگست

ہم سب سے آج کہتا ہے خوشیوں کا یہ سماں
بزمِ سخن سجاؤ کہ ہے پندرہ اگست

مایوس ہو کے بیٹھنا اچھا نہیں ہے آج
کچھ حالِ دل سناؤ کہ ہے پندرہ اگست

پیغام دے رہا ہے ترنگا ہمیں یہی
خوشیوں کے گیت گاؤ کہ ہے پندرہ اگست

ہندوستاں کو مل گئی انگریزوں سے نجات
ہر اک کو یہ بتاؤ کہ ہے پندرہ اگست

رہبرؔ یہ دن ملا بڑی قربانیوں کے بعد
مل کر خوشی مناؤ کہ ہے پندرہ اگست

ڈاکٹر فخرالکریم

گلاب باڑی کالونی، پریاگ راج-Mob.9335118380

ایک چادر میلی سی: ایک مختصر جائزہ
(خانگی زندگی کے تناظر میں)

اردو کے صاحب طرز ادیب اور مایۂ ناز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کی یہ پہلی اور آخری کاوش ہے جو ایک ناولٹ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔اس ناول کو ہندوستان کے سب سے بڑے انعام ''ساہتیہ اکادمی ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔خود بیدی نے یہ اعتراف کیا تھا کہ اس تصنیف پر انھوں نے خاصی محنت کی ہے اور اس کے تانے بانے درست کرنے میں تقریباً دس سال صرف ہوئے۔''ایک چادر میلی سی'' جنوری ۱۹۶۲ء میں مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نئی دہلی سے پہلی بار شائع ہوا۔

اس ناول کا پس منظر پنجاب کی مقدس سرزمین ہے، جس کی مادرانہ عظمت کا مصنف قائل ہے۔بظاہر یہ بہت ہی مختصر ہے لیکن اس کا کینوس اور اس کی تہذیبی معنویت بیحد وسیع ہے۔''ایک چادر میلی سی'' اس پنجابی رسمِ شادی کی داستان ہے جس میں عورت پر ایک چادر ڈال کر مرد اس کا خاوند قرار پاتا ہے۔اس خاندانی رسم کے ذریعہ سماج کے نچلے طبقے کی زندگی کی خستگی، برائیوں اور لعنتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔گو کہ اس کہانی کا تعلق پنجاب سے ہے لیکن واقعات کی بنا پر ہم اسے پورے ہندوستان کے نچلے طبقے کی زندگی کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔

''ایک چادر میلی سی'' پنجاب کے ایک دیہی خاندان کی کہانی ہے۔اس میں زیادہ تر ایسے خاندان ہیں جن کا ذریعۂ معاش یکّہ چلانا ہے۔ایسا ہی ایک خاندان تلوکے کا ہے اس کی بیوی رانو کی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔اس کا شوہر تلوکے چودھری مہربان داس کی بدکاریوں میں معاونت کرتا ہے۔چودھری کی صحبت میں شراب کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی خانگی زندگی کو جہنم بنا لیتا ہے۔جب رانو اسے شراب نوشی سے منع کرتی ہے تو وہ رانو کو مارتا پیٹتا ہے۔وہ ہمیشہ کی طرح مفلس و مجبور ہے، جسے نہ کبھی ماں کا پیار ملا اور نہ شوہر کی محبت۔اوپر سے ساس کی بدمزاجی اس کی زندگی میں زہر گھولتی رہی۔اس طرح سے بیدی نے ہندوستانی خاندانوں میں ساس کا ایک مخصوص تصور اور کردار پیش کیا ہے۔رانو سے جنداں کی بدسلوکی ملاحظہ ہو:

> ''جنداں رات دن چوبیس گھنٹے چمکا کرتی۔رانی کو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تکلے کھڑے ہو جاتے اور رانی پر اپنی گالیوں کی چھاجوں کے چھاج خالی کر دیتی۔رانڈیے! ڈائنے چڑیلے میرے بیٹے کو

کھا گئی اور ہم سب کو کھانے کے لیے منھ پھاڑے
ہوئے ہے۔ چلی جا۔ جدھر منھ کرنا ہو کرلے، اب اس
گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے تیرے لیے۔''

(ایک چادر میلی سی۔ص:۴۹)

تلوکے کے قتل کے بعدرانو کی زندگی میں پریشانیوں کا ایک سیلاب آجاتا ہے۔ خاندان کا سارا بوجھ جس میں جوان بیٹی، تین چھوٹے بچے بھی شامل ہیں، اس کے دیور منگل کے کندھوں پر پڑتا ہے۔ روز روز کے فاقے، ڈائن ساس جو اسے ہر وقت گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیتی رہتی ہے، رانو کی خانگی زندگی کو اور دشوار بنا دیتی ہے۔ لیکن اس پریشان کن خانگی زندگی کے باوجود وہ ایثار و قربانی کے سائے میں اپنے بچوں کو چھپا لیتی ہے اور ہر مصیبت کو برداشت کرتی چلی جاتی ہے۔ پڑوسن اسے مشورہ دیتی ہے کہ گاؤں میں رہنا ہے اور زندگی گزارنی ہے تو گاؤں کے رواج کے مطابق چھوٹے دیور سے چادر ڈلوالو۔ یہ سن کر رانو کو چکر آجاتا ہے۔

ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب منگل کو رانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہو
لہان تھا اور رانو مکمل طور پر بیہوش لیکن عورتوں کو
یقین تھا کہ آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا
............اگر چہ چادر کی رسم معمولی ہوتی ہے اور
اس میں بہت کچھ نہیں کیا جاتا............لڑکا
عام طور پر لڑکی کے یہاں جا کر اسے بیاہ کر لاتا ہے
لیکن اس وقت لڑکی کا مائکہ بھی یہی اور سسرال بھی
یہی۔ آگا بھی یہیں اور پیچھا بھی یہیں۔''

منگل رانو سے عمر میں دس گیارہ سال چھوٹا ہے۔ اس نے منگل کو بچوں کی طرح پالا تھا۔ رانو اس کے لیے تیار نہ تھی۔ لیکن ماں ہونے کے ساتھ ساتھ عورت بھی تھی۔ چنانچہ منگل کو دولہا بنا کر دونوں کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے بعد اس کی خانگی زندگی پھر ایک اہم موڑ سے گذرتی ہے۔ منگل گاؤں کی ایک آوارہ لڑکی سلامتی میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ زندگی کے اس موڑ پر وہ بڑے صبر کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اب تک وہ بہو، بیوی اور ماں کے روپوں میں ظاہر ہوئی تھی لیکن اب وہ ایک ٹھیٹ عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور اپنی نسائیت کا جادو جگاتی ہے کہ منگل گھر کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ نوجوان جس نے تلوکے کو قتل کیا تھا ''بڑی'' سے محبت کرنے لگتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب رانو کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ صدمے سے بیہوش ہو جاتی ہے اور جب بڑی کی طرف دیکھتی ہے تو اس کی گھبرائی ہوئی نگاہیں ایسا کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں:

''ماں یہ تو کیا کر رہی ہے۔ تو نہ بھول میں
بن بیاہی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی۔''

(ایک چادر میلی سی۔ص:۱۳۸)

آخر میں رانو اس رشتے کو قبول کر لیتی ہے اور ایک بار پھر وہ اپنے ایثار و قربانی، خدمت و محبت سے گھر کو مزید خلفشار سے بچا لیتی ہے اور گھر میں خوشیاں بکھر جاتی ہیں۔

بیدی نے اس ناول کے ذریعہ بڑے معنی خیز انداز میں خانگی زندگی میں عورت کی اہمیت اور معنویت کے پیش نظر

اس کی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔خانگی زندگی میں عورت بیوی ہے، ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے اور محبوبہ ہے۔غرض عورت کے یہ تمام روپ اس مختصر سے ناول میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بقول وقارعظیم:

''عورت ماں ہے، بیوی ہے اور بہن ہے۔اس کے علاوہ اس کے دم سے دنیا کے اور بہت سے رشتے ناتے ہیں............بیدی کے دل میں اس عورت کے لیے گہرے روحانی جذبات ہیں جو بیوی ہے گھر کے سیدھے سادے ماحول میں ان کی نظریں جہاں گئیں سچے اور پُرخلوص جذبے کی ترجمان ہے۔''

ناول کا ایک اہم پہلو منگل اور رانو کے کرداروں کی جنسی اور نفسیاتی الجھنیں ہیں جس کو بیدی نے بڑے فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ یہ بات ایک ماہرِ نفسیات اور ماہر جنسیات سے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ایک شادی شدہ عورت کس طرح اپنی خواہشات سے لڑتی ہے اور اس پر پوری طرح سے قابو پالیتی ہے۔دوسری طرف ایک نوجوان لڑکا رشتوں کی پاکیزگی کا اس حد تک پاسدار ہے کہ الجھنوں کو کافی حد تک سلجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیابی نہیں ملتی۔بالآخر وقت ایسا کرشمہ دکھاتا ہے کہ ان دونوں افراد کی الجھنیں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔پھر ازدواجی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس میں فطرت کا دخل زیادہ ہوتا ہے جو اپنے تقاضوں کی تکمیل کر ہی لیتی ہے۔

بیدی کی تمام نگارشات کا محور و مرکز عورتوں کے مسائل ہیں۔خصوصاً عورت کا مقدر، اس کی مجبوریاں، اس کا اقتصادی اور سماجی استحصال، مرد اساس سماج میں اس پر ہونے والے مظالم بیدی کی تخلیقات کے جزوِاعظم ہیں۔ عورت آج بھی اقتصادی اور معاشرتی طور پر مردوں کے دباؤ میں رہتی ہے۔ رانو کا کردار انھیں حالات کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ رانو کے گھر کی روزمرّہ کی زندگی بیدی نے کچھ اس طرح پیش کی ہے کہ پنجاب کا معاشرہ اپنی سماجی کیفیات اور سکھوں کے رہن سہن، رسم و رواج کے ساتھ جلوہ گر ہے اور کوٹلہ گاؤں کی زندگی اپنے سماجی اور تہذیبی رنگ میں پوری طرح منعکس نظر آتی ہے۔

اس طرح سے ''ایک چادر میلی سی'' بیدی کا بہترین ناول ہے، جس میں مزدور طبقے کی خانگی زندگی، ان کے اخراجات، شراب نوشی کی لت جس کی وجہ سے خانگی زندگی برباد ہو جاتی ہے اور اس میں سکون نام کی چیز تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ ساری خامیاں ہمیں ایک مزدور کی زندگی میں دکھائی دیتی ہیں۔ پنجابی زبان کے الفاظ اور محاورے کہانی میں مزید جان ڈال دیتے ہیں اور اکھڑی اکھڑی شکستہ اردو میں واقعات کا ارتباط قابلِ ستائش ہے۔ ایک آخری بات۔ ناول میں تہذیبی اور معاشرتی زندگی پوری طور پر متحرک نظر آتی ہے جسے پیش کرتے وقت بیدی نے بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔

❑❑❑

سلیم خاورؔ

تیتروالی پاکھڑ، رام پور-Mob.8791648522

غزل

وطن میں ہم امن و اماں مانگتے ہیں
وہی مسکراتا جہاں مانگتے ہیں

ہوں جس میں سبھی دھرم کے لوگ یکساں
ہم ایسا ہی ہندوستاں مانگتے ہیں

وہ رنگین راتیں وہ دلکش نظارے
ستاروں سے ہم کہکشاں مانگتے ہیں

ہوں ہندو بھی مسلم بھی سکھ اور عیسائی
وہ بھارت میں ہم گلستاں مانگتے ہیں

مثالوں میں نام آئے ہندوستاں کا
کتابوں میں وہ داستاں مانگتے ہیں

ہماری نظر میں جو ہیں طفل مکتب
وہ ہاتھوں میں تیر و کماں مانگتے ہیں

وفاؤں پہ اُن کی بھروسہ ہے خاورؔ
ہم عہد محبت کہاں مانگتے ہیں

●●●

اعظمؔ صدیقی

وزیر باغ لکھنؤ-Mob.8799407461

غزل

کس کو ہمدردی یہاں ہو اس دلِ برباد سے
گونگے بہروں کی ہے بستی ہوگا کیا فریاد سے

ظلم کرنے والوں کا انجام ہوتا ہے برا
یہ سبق ہم کو ملا فرعون اور شداد سے

یاد کرتے ہیں تجھے تسبیح کے دانوں پہ بھی
ہم کبھی غافل نہیں ہوتے ہیں تیری یاد سے

ایک جیسا بھی مزاجِ حسن کب آیا نظر
وہ کبھی ناراض ہوتے ہیں کبھی وہ شاد سے

باندھ کر سر پر کفن نکلے ہیں گھر سے اس لئے
ختم کرنا ہے ہمیں اب ظلم کو بنیاد سے

اپنے بوڑھے باپ کا وہ کب سہارا بن سکا
فائدہ کچھ بھی نہیں ایسی جواں اولاد سے

اس لئے جو کچھ بھی تھا اعظمؔ نے حاضر کر دیا
دل کو ملتا ہے سکوں مظلوم کی امداد سے

●●●

مینا عرفان

نیا گاؤں، لکھنؤ- Mob.9235707806

سلمیٰ صدیقی: حیات اور کارنامے

بڑی بڑی غزالی آنکھیں، ان پر گھنی پلکیں، کھڑی ستواں ناک، چوڑی پیشانی بے حد پُرکشش شخصیت کی مالک سلمیٰ صدیقی جو عرف عام میں سلمیٰ آپا کہلاتی تھیں، اردو ادب معروف نقاد، ادیب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر جناب رشید احمد صدیقی کی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش ۱۸رجون ۱۹۳۱ء کو وارانسی میں ہوئی۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اردو میں ماسٹر کی ڈگری لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے گرلس کالج میں کچھ عرصہ تدریس کا کام انجام دیا۔ خاندان کی مرضی سے سلمیٰ صدیقی کی پہلی شادی ان کے بڑے بھائی کے کلاس فیلو خورشید عادل منیر سے ۱۹۴۶ء میں ہوئی جن سے ان کے ایک بیٹا ہوا۔ سلمیٰ آپا کی دوسری شادی اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر سے ۱۹۵۷ء میں ہوئی۔ کرشن چندر کی پہلی شادی لاہور میں گھر والوں کی مرضی سے ودیا وتی سے ہوئی جن سے کرشن چندر کے تین بچے ہوئے۔ سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر دونوں کی ہی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی اور ان دونوں کی اپنی جیون ساتھی سے ذہنی مطابقت ہی نہیں تھی یہی بات ان دونوں کو قریب لے آئی۔

سلمیٰ صدیقی اپنی دوسری شادی کے بارے میں ممبئی سے نکلنے والے رسالے فن اور شخصیت کے آپ بیتی نمبر میں لکھتی ہیں:

’ہماری شادی چند مشترکہ دوستوں کی موجودگی میں نینی تال میں ہوئی کیونکہ یہ عام شادی نہیں تھی اس میں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں میں نے کرشن جی سے کہا شادی ہوگی کیسے؟ کرشن جی نے کہا جیسے ہوتی ہے میں نے کہا لیکن اماں بی بی (یعنی ان کی والدہ) تو صرف نکاح کو ہی شادی مانتی ہیں۔ کرشن جی کہنے لگے تو ہم بھی نکاح کو ہی شادی مان لیں گے۔ آخر کار ایک دوست رام پور سے ایک مولوی صاحب اور کچھ گواہوں کو لے کر آئے اور سوئس ہوٹل نینی تال میں وہ واقعہ ظہور پزیر ہوا جسے نکاح کہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے پوچھا جناب کا نام، جناب نے جواب دیا کرشن چندر۔ مولوی صاحب اوران کے ساتھی چونک گئے حالات معلوم ہونے پر مولوی صاحب نے پوچھا آپ نے اچھی طرح غور کر لیا ہے۔ میں پریشان ہو کر کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو کرشن چندر اپنا اسلامی نام وقار ملک رکھ چکے تھے۔‘‘

سلمیٰ صدیقی کا نکاح اسلامی طریقے سے کرشن چندر سے ہوا۔ نکاح نامہ لکھا گیا اور ۵۱ ہزار روپے مہر طے ہوا۔ اس واقعہ کا ذکر جگدیش چندر ودھان کی کتاب ’’کرشن چندر شخصیت اور فن‘‘ میں بھی ملتا ہے۔

سلمیٰ صدیقی اور کرشن چندر ترقی پسند مصنفین تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ سلمیٰ صدیقی بے حد ذہین، حاضر جواب، حسِ مزاح رکھنے والی اردو اور اپنی تہذیبی روایات سے محبت کرنے والی شخصیت تھیں۔ انھیں یہ خوبیاں اپنے والد رشید احمد صدیقی سے ورثے میں ملی تھیں۔

علی گڑھ میں رشید احمد صدیقی کے ہرے بھرے لان اور گلابوں کے پھولوں سے لدے پیڑوں سے سجی کوٹھی علم و ادب کا گہوارہ تھی جہاں نہ صرف ملک کے بلکہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب، شاعر اور دانشوروں کا میلہ سالگا رہتا ایسے ماحول میں پرورش یافتہ سلمیٰ صدیقی کا ادب کے تئیں رجحان فطری عمل تھا۔

ترقی پسند مصنفین میں خواتین افسانہ نگاروں میں سرفہرست جو نام لئے جاتے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور صالحہ عابد حسین ہیں۔ ان کے بعد کی افسانہ نگاروں میں سلمیٰ صدیقی کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے عورت کے مسائل، اس کی نفسیات اور کرب کا بہت قریب اور باریکی سے مشاہدہ کیا اور اپنی تحریروں میں اتارا ہے۔ وہ عورت کی کمزوریوں اور اس کی طاقت سے خوب واقف ہیں۔ سلمیٰ صدیقی نے عورتوں کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۷۶ء میں ''مٹی کا چراغ'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں ۹ کہانیاں شامل ہیں۔ ان کی کہانی منگل سوتر، بھروسہ، گلہری کی بہن، کو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا لیکن سلمیٰ صدیقی کو سب سے زیادہ شہرت ان کے ناول ''سکندر نامہ'' نے دلائی۔

سکندر نامہ کے دیباچہ میں خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

> ''کیا وجہ ہے کہ زندگی میں اور ادب میں بدھو کی حماقتوں پر سب ہنستے ہیں لیکن کوئی اس سے نفرت نہیں کرتا بلکہ بچے تو بدھو سے پیار کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ بدھو عمر میں بڑا یا بوڑھا ہونے پر بھی ایک بچے کا سا مزاج رکھتا ہے جو سلمیٰ کے سکندر کی طرح مغل اعظم کو مرغ اعظم کہتا ہے مگر کبھی جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتا۔ جو طوائف سے راکھی بندھواتا ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ دنیا اس پر ہنس رہی ہے۔''

''سکندر نامہ''، سلمیٰ صدیقی کے گھریلو ملازم سکندر کی کہانی ہے جو اتر پردیش کے بدایوں سے تعلق رکھتا تھا اور ۵۵ سال سے زیادہ عرصے سے وہ سلمیٰ صدیقی کے خاندان کے ساتھ تھا اور بقول سلمیٰ آپا کے سکندر کی شہرت نے بدایوں کے پیڑوں کی شہرت کو مات کر دیا تھا۔

سکندر نامہ کے منفرد فلسفے، محاوراتی زبان اور اپنی ہی منطق کے طرز عمل کی عکاسی نے اس ناول کو بہت مقبول بنایا وہ کہتی ہیں اس سکندر کی کہانی اس تاریخی سکندر اعظم جس نے دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس سے بالکل مختلف ہے وہ دنیا کو فتح کرنے کا کیا سوچتا اس نے تو دنیا کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ سکندر اور بے وقوفی کا رشتہ چولی دامن کا تھا۔ سکندر نامہ میں سلمیٰ آپا کے مزاح کا رنگ خوب نظر آتا ہے وہ لکھتی ہیں سکندر وہ مخلوق ہے جس پر پیدا کرنے والے کو اتنا فخر نہیں ہوگا جتنی حیرت ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ سکندر خود اپنی

بے مثل صلاحیتوں سے قطعاً ناواقف ہے سکندر کی بیوقوفیوں کو سمجھنے کے لئے بہت سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔

سلمیٰ صدیقی کا بدایوں والا سکندر ایسا حقیقی کردار ہے جو شیکسپیئر کے ڈراموں میں موجود جوکر یا احمق کے کردار کی مانند زندگی کو بڑی گہرائی اور سنجیدگی سے دیکھتا ہے۔

سلمیٰ صدیقی کے ناول سکندر نامہ پر دوردرشن نے ۱۹۹۱ء میں ایک سیریل بھی نشر کیا تھا ''کرنام سکندر کے'' عنوان سے۔آیئے ان کی کچھ کہانیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

سلمیٰ صدیقی کی کہانی 'سمجھوتہ' میں ایک ایسی عورت فاطمہ بائی کے ذریعہ عورت کی دیرینہ خواہش اور اس کی دکھتی رگ پر قلم رکھا گیا ہے جو حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ عورت کے پاس عیش وعشرت ہوں اور اولاد نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ یہ بات ان عورتوں کے لئے اور بھی مسئلہ بن جاتی ہے جن کے شوہر ملک سے باہر رہتے ہیں اور سال میں ایک مہینے کے لئے ہی گھر آتے ہیں ایسے میں وہ عورت کیا کیا جتن نہیں کرتی۔

حاجی صاحب کے آنے سے قبل وہ منتیں مانتیں، درگاہوں پر حاضری دیتیں، محتاجوں کو کھانا کھلاتیں، مزاروں پر چادریں چڑھاتیں، ڈاکٹروں کی دوا اور کربلائے معلی کی خاکِ شفا کھا کر اپنے خیال میں پورے کیل کانٹے سے لیس ہوکر حاجی جی کا استقبال کرتیں۔ حاجی جی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتیں۔ان کے جانے کے بعد چند ہفتے وہ اس امید پر گزارتیں کہ اللہ شاید ان کے دل کی مراد پوری کر دے۔وہ گھر کے کام کاج سے الگ رہتیں، خوب سنبھل سنبھل کر ناپ تول کر قدم اٹھاتیں۔کھانے پینے میں اس قدر احتیاط برتتیں کہ کہیں کوئی گرم چیز نہ کھالیں، بوجھ اٹھانے سے اس قدر گھبراتیں کہ کچھ دنوں تک قریب رکھے پاندان کو اٹھانے سے بھی گریز کرتیں۔ پھر امید کے دن گزر جانے پر وہ موم بتی کی طرح پگھل پگھل کے ڈھے جاتیں۔اس کہانی میں زندگی کی وہ سچائی بھی نظر آتی ہے کہ قدم قدم پر کس طرح سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔

حاجی جی کے انتقال کے بعد فاطمہ بائی پر یہ راز کھلا کہ انھوں نے چند سال پہلے نیروبی میں دوسری شادی کر لی تھی اور ان کے انتقال سے دو ماہ قبل ایک بیٹا پیدا ہوا تھا حاجی جی کی وصیت کے مطابق ان کی دوسری بیوی بیٹے کو فاطمہ بائی کے سپرد کرنے آرہی تھی۔ فاطمہ بائی اس سے ملنے کو راضی نہیں تھیں مگر مستری کے کافی سمجھانے پر ملنے کے لئے راضی ہوگئیں۔ دوسری بیوی بچے کو روتا ان کے قدموں میں ڈال کر چلی گئی مگر فاطمہ بائی بالکل ساکت رہی۔ جب مستری نے بچے کو ان کی گود میں یہ کہتے ہوئے ڈالا کیسی ماں ہو بچہ رو رہا ہے تو وہ اسے کلیجے سے لگا لیتی ہیں۔ بلکہ مستری جن کی ایک آنکھ نہ ہونے کی وجہ سے کہیں شادی نہیں ہو پاتی تھی ہر جگہ سے ٹھکرا دئے جاتے تھے اکیلے ہی لاخیروں کی زندگی جی رہے تھے انھیں بھی فاطمہ بائی کہانی کے آخر میں اپنا لیتی ہیں اور کہانی میں اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ اسی طرح سمجھوتہ کر کے انسان کی زندگی آگے چلتی رہتی ہے۔

ان کی مشہور کہانی 'منگل سوتر' میں ایک لڑکی زرینہ کی

کہانی کے ذریعہ سلمیٰ صدیقی نے محبت کے لطیف جذبہ، شکستگی کے احساس اور کرب کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ زرینہ جو دوسرے مذہب کے لڑکے نرمل کو ٹوٹ کر اتنا چاہتی ہے کہ اپنے اس شفیق باپ جس نے ماں کے انتقال کے بعد ماں باپ بن کر بڑی محبت سے پالا تھا چھوڑنے کو راضی ہو جاتی ہے مگر نرمل کے شادی سے انکار کے بعد اس کے پاس موت سے شادی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔ وہ حاملہ تھی ایسے میں اسے کوئی دوسرا راستہ نہیں سوجھتا سوائے خودکشی کے۔اس کہانی کا انجام کتنا دردناک ہے۔مردہ خانے میں زرینہ کی لاش کو اس کے باپ اور نرمل دونوں ہی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

منگل سوتر میں زرینہ کے یہ کلمات دل کو چھو لیتے ہیں کہ ''مذہب ضرور کسی مرد نے ایجاد کیا ہوگا۔ماں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس کا دھرم تو اس کا بچہ ہی ہوتا ہے۔''

سلمیٰ صدیقی کی طنز و مزاح، جذبات و احساسات سے بھرپور تحریریں دل پر اثر کرتی ہیں اور قاری کو باندھے رکھتی ہیں۔سلمیٰ صدیقی زبردست تخلیقی صلاحیتوں کی مالک تھیں مگر انھوں نے کبھی کرشن چندر سے آگے نکلنے کی خواہش نہیں کی اور ہمیشہ ان کی پرچھائیں بن کر رہیں۔۱۹۷۷ء میں کرشن چندر کے انتقال کے بعد وہ ممبئی میں تنہا رہ گئیں۔ فروری ۲۰۱۷ء میں ۸۹ سال کی عمر میں انھوں نے آخری سانس لی اور اس کے ساتھ دو محبت کرنے والوں کی رومانی کہانی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

❑❑❑

فرزانہ پروینؔ
کمبر اسٹریٹ، کولکاتا-Mob.7003222679

غزل

سلسلہ چھیڑا ہے کیسا عشق کی تشہیر کا
میں فسانہ کیا سناؤں عاشق دلگیر کا

اس نے خود ڈالی تھی مجھ پر بس نگاہ سرسری
آج بھی گھائل ہے دل اس اک نظر کے تیر کا

میرے ذہن و دل پہ اس کی یاد قابض ہو گئی
حکمراں وہ بن کے بیٹھا ہے مری جاگیر کا

ہوش دنیا کا ہے مجھ کو اور نہ کچھ اپنا خیال
ہے عجب قصہ یہ میرے قلب کی تسخیر کا

بٹ گئی ہے سیکڑوں ٹکڑوں میں شخصیت مری
مسئلہ اب کیسے حل ہو ذات کی تعمیر کا

چاہے جتنے رنگ بھر دو عاری ہے جذبات سے
حال کیسے ہو بیاں اس درد کی تصویر کا

خواب میرا آگیا بن کر حقیقت سامنے
دیکھ فرزانہؔ کرشمہ یہ مری تقدیر کا

●●●

ایڈوکیٹ حبیب ریتھ پوری

ریتھ پورضلع، امراوتی (مہاراشٹر)9403860486

اپنے اپنے سکھ دکھ

آج اتوار ہے۔ شہر میں لگنے والے بازار کا دن بازار میں ہر قسم کی مختلف چیزوں کی دوکانیں سج گئی تھیں۔ خریدار لوگوں کی گہما گہمی بھی بڑھ گئی تھی ہر کوئی اپنی اپنی ضرورت اور پسند کی چیزیں خریدنے میں مصروف تھا۔

ایک بوڑھا شخص جس کی عمر تقریباً اسّی برس ہوگی۔ سفید نفیس صاف ستھرا لباس پہنے پیروں میں قیمتی چپل، ہاتھوں میں نوٹ اور ریزگاری دبائے سودا سلف خرید رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے مگر پورے اعتماد سے ایک دوکان سے دوسری اور پھر تیسری دوکان چل کر جارہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں نوٹ اور چلر پیسے تو تھے۔ مگر سامان لینے کے لئے کوئی تھیلی نہیں تھی۔ اس سے چار قدم کی دوری پر تیس بتیس برس کا جوان اپنے دونوں ہاتھوں میں تھیلیاں اٹھائے چل رہا تھا۔ بوڑھا دوکان پر جاتا، چیزیں پسند کرتا پھر دوکاندار سے بھاؤ تاؤ کرتا اور اپنی پسند کی عمدہ اور نفیس چیزیں چن چن کر اٹھاتا دوکاندار وہ چیزیں تول کر دیتا تو پیچھے کھڑا وہ جوان آگے بڑھ کر اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ان تھیلیوں میں لے لیتا۔ بوڑھا پیسے دیتا اور پھر یہ دونوں آگے بڑھ جاتے۔

میں نے تھوڑی دیر ایک جگہ کھڑے ہو کر یہ منظر دیکھا۔ مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ کچھ تشویش بھی ہوئی۔

جہاں میں کھڑا تھا۔ اس راستے کے باز و اسٹیل کے برتنوں کی ایک دوکان تھی۔ دوکان میں کوئی گاہک تو نہیں تھا۔ مگر تین لوگ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا موضوع بھی وہی بوڑھا خریدار اور تھیلیاں اٹھائے ہوئے جوان تھا۔

مجھے ان کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں وہیں راستے سے تھوڑا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور ان کی باتیں سننے لگا۔

پہلا شخص جس کی عمر ساٹھ پینسٹھ برس ہوگی کہنے لگا۔

''دیکھوا سے کہتے ہیں فرمانبرداری''

اس جواں عمری میں بھی ہاتھوں میں سودا سلف کی بھری ہوئی تھیلیاں لئے باپ کے پیچھے خاموش چل رہا ہے۔ ورنہ آج کل کی اولاد۔۔۔! اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کے لفظوں میں حسرت اور آواز میں یاسیت تھی۔ شاید وہ اس کی ذاتی زندگی کا کوئی المیہ ہو۔

اس کے خاموش ہوتے ہی دوسرا کہنے لگا۔

''بڑے میاں کو آج بھی اپنی پسند کی عمدہ اور نفیس معیاری چیزیں خریدنے کا شوق ہے۔ اسی لئے تو اس عمر میں

بھی بازار کی بھیڑ میں لڑکھڑاتے قدموں سے گھوم رہے ہیں۔اور پھراس طرح کا چلنا پھرنا ان کی صحت کے لئے بھی مفید ہے۔اوراولاد کی تربیت کے لئے بھی ضروری ہے۔''

اب وہ تیسرا شخص جوابھی تک خاموش تھا۔کہنے لگا۔

''بڈھے کوشرم نہیں آتی۔اب جب خود قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے۔اپنے ہاتھ سے راجوٹ چھوڑنے کوتیار نہیں ہے۔جوان بیٹے کوآزادی دینے کے بجائے ،اپنے پیچھے پیچھے یوں تھیلیاں اٹھائے گھما رہا ہے۔کیا بچوں کواس عمر میں بھی آزادی نہیں دے دینی چاہیے۔'' مگر کچھ لوگ ہوتے ہی ہیں اس مزاج کے۔انھیں مرتے دم تک ہاتھ سے پیسہ چھوڑنا نہیں آتا۔وہ چھوڑنا نہیں چاہتے سالے کنجوس۔میں نے ان تینوں کی باتیں سنیں۔تینوں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق کمنٹس کر دیے تھے۔ان کے وہ کمنٹ سن کر مجھے بھی اس بوڑھے اور جوان کے حالات میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

وہ ضعیف شخص دھوپ کی تمازت اور گرمی کی شدت سے کچھ پریشان سے ہونے لگے تھے میں نے ان کے قریب جا کر کہا۔۔۔! بزرگ آپ تھوڑی دیر اس دوکان کے اندر سائے میں بیٹھ کر آرام کر لیجئے۔آپ بہت تھکے تھکے سے لگ رہے ہیں۔انھوں نے میری پیش کش قبول کر لی اور جہاں وہ تینوں گپ شپ کر رہے تھے۔وہاں ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

کولر اور پنکھے کی ٹھنڈی ہوا سے انھیں راحت ملی۔ ان کے حواس بحال ہو گئے۔ایک گلاس پانی پی کر اپنے سفید رومال سے پسینہ پونچھا۔اور پھر ان سب کا شکریہ ادا کیا۔

اب مجھ سے برداشت نہ ہوا تو ان تینوں کی پہلے والی گفتگو اور کمنٹس کا جواب پانے کے لئے میں نے ان سے سوال کر دیا۔

''آپ اس عمر میں جب آپ کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔اتنی شدید گرمی میں بازار کی ایک دوکان سے دوسری دوکان کا چکر لگا رہے ہیں۔یہ کام تو یہ جوان بھی کر سکتا ہے۔کیا آپ کواس جوان پر اعتماد نہیں ہے۔یا پھر اپنے اپنے ہاتھ سے کاروبار اور پیسہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔''

ان بزرگ نے میری طرف یوں مسکرا کر دیکھا گویا میری نادانی کا مذاق اڑا رہے ہوں۔تھوڑی دیر خاموش رہ کر وہ کہنے لگے ہاں بیٹے تم نے بہت اچھا سوال کیا۔۔۔تو سنو!

میں بچپن ہی سے نفاست پسند ہوں۔چاہے وہ کھلونا ہو۔کھانا ہو۔بستر ہو۔کپڑا ہو۔یا کتابیں مجھے نفیس اور عمدہ چیزیں پسند اور مرغوب ہیں میں بازار سے سبزی، پھل اور ترکاریاں بھی نفیس اور عمدہ خریدنے کا عادی رہا ہوں۔کیونکہ قیمت تو سبھی چیزوں کی دینی ہوتی ہے۔پھر اگر اتنی ہی یا اس سے کچھ زیادہ قیمت میں اچھی، عمدہ اور نفیس چیزیں مل سکتی ہوں۔۔۔تو۔۔۔

یہ میرا بیٹا بھی بازار سے سودا سلف خرید کر لاتا ہے۔ مجھے اس پر پورا پورا اعتماد بھی ہے۔اور میں نے تو دس برس پہلے ہی سارا کاروبار اسے سونپ دیا تھا۔سوائے میری پینشن کے مگر مجھے کبھی کبھی شوقیہ طور پر بازار میں جانا اور سودا سلف خریدنا اچھا لگتا ہے۔میرا بیٹا اپنی ضرورت کے مطابق سامان لاتا

ہے۔مگر میری عادت رہی ہے کہ!اپنی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خریداری کرتا ہوں تا کہ اپنے گھر میں تو تنگی کا احساس بالکل نہ ہو۔اگر کسی دن پڑوسی کوئی چیز مانگ لے تو وہ خالی ہاتھ نہ جائے۔اس لئے میں اپنی ضرورت سے زیادہ ہی خریداری کرتا ہوں۔کچھ چیزیں چھوٹے بیوپاریوں سے بھی بلاضرورت خرید لیتا ہوں تا کہ ان بیچاروں کا بھی پیٹ چلتا رہے۔ بیٹا پیاز دو کلولاتا ہے۔ میں پانچ کلو خریدتا ہوں۔اور باقی سب بھی اسی طرح اور سنو میں ایک لطیفہ سناتا ہوں۔اب بزرگ سانس لینے کے لئے رک گئے۔اور ہم سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

بزرگ نے کہنا شروع کیا۔

ایک نوجوان بازار میں چیزیں خرید رہا تھا۔ دوکاندار نے اس سے بڑی سادگی سے کہا۔

میاں! تم بی۔اے پاس ہو۔نوجوان کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ! اس معمولی پڑھے لکھے دوکاندار کو میری تعلیم نے متاثر کر دیا ہے۔اس نے دوکاندار سے پوچھا آپ نے کیسے جانا کہ! میں بی۔اے۔ پاس ہوں اور آپ کی تعلیم۔۔۔۔!؟

دوکاندار نے کہا میری تعلیم۔اے۔بی۔سی۔ڈی ہاں مگر تمہاری تعلیم کا اندازہ میں نے یوں لگایا کہ آپ نے پہلے ٹماٹر خرید لئے۔اس کے اوپر آلو اور اس کے اوپر پیاز ڈالی ہے۔اس سے میں نے سمجھا کہ آپ نے اے۔ بی نہیں بی۔اے پڑھا ہے۔لطیفہ سن کر سب نے بے اختیار قہقہ لگایا مگر وہ بزرگ خاموش اور سنجیدہ ہی رہے۔

پھر کہنے لگے علم کے ساتھ مشق اور مشق سے شعور پیدا ہوتا ہے جو تربیت سے حاصل ہوتا ہے عمر کے ساتھ تجربہ انسان کو شعور بخشتا ہے۔اور یہ میری تربیت کا عمل ہے جو اس جوان بیٹے کو ساتھ لئے بازار سے خریداری کر رہا ہوں۔ پھر میری ماں اکثر کہتی تھیں۔ بازار سے چیزیں بھر بھتولہ لایا کرو اور سوپ بھر ہو تو برکت ہوتی ہے۔سامان بھر بھتولہ اور سوپ بھر ہو تو برکت ہوتی ہے۔گھر میں تنگی اور افلاس کا احساس نہیں ہوتا۔ ورنہ بی۔اے پاس نوجوان تھیلی میں پہلے ٹماٹر اور پھر آلو پیاز۔۔۔۔

اس طرح چلنے پھرنے سے میرے گھٹنوں کا درد بھی کچھ کم ہو جاتا ہے۔اور دن بھر پلنگ پر پڑے رہنے سے جو کسل مندی آجاتی ہے وہ بھی دور ہو جاتی اور میں چاق و چوبند ہو جاتا ہوں۔ یہاں بازار میں کئی ملنے جلنے والے دوست احباب سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔بدلتے حالات سے آشنائی بھی ہو جاتی ہے۔تو ہفتے میں ایک دو بار بازار آ جانے میں کیا برائی ہے۔ رہا سوال میرے بیٹے کی فرمانبراری کا تو یہ نعمت بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔ وہ لوگ بدنصیب ہیں جن گھروں کی جوان نسل اپنے گھروں کے بزرگوں کے فرمانبردار نہیں ہوتی۔ میں خوش نصیب ہوں۔ ورنہ اکثر گھروں میں تو باپ بیٹوں کے درمیان کی ناچاقی کی وجہ سے گھر میں ہر وقت تناؤ بنا رہتا ہے۔یا پھر میدان جنگ کی سی صورت رہتی ہے۔باقی آپ اس سے بھی پوچھ لیجئے۔

اب پورے ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔ باپ کی ایما پر بیٹا کہنے لگا۔

رہا کاروبار کا سوال تو میرے ابو نے مجھے دس برس پہلے ہی خود مختار بنا دیا تھا۔تیس ایکٹر کھیت اور تین لاکھ روپیہ نقد دے کر کاروبار مجھے سونپ دیا تھا۔ اس بات کو اب دس برس ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کبھی پلٹ کر حساب تک نہیں پوچھا کھیتی میں خسارہ ہونے پر حسب ضرورت وہ اپنی پینشن کی رقم سے وقتاً فوقتاً میری مالی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ میری کمائی یا آمدنی سے انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی طلب نہیں کیا۔گھر کا سارا خرچ وہ اپنی پینشن کی رقم سے چلاتے ہیں۔اناج، کرانہ، دودھ، سبزی، کپڑے لتے تہوار مہمانوں کی خاطر داری پوتیوں اور پوتے کی فرمائش سب وہی پوری کرتے ہیں۔گھر کے کسی بھی بچے کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ ماں باپ سے کہنے کی بجائے دادا کی گود میں بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں ان کے کان میں کہہ دیتا ہے اور اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

رہی دوسری بات کہ! میں ان کے پیچھے تھیلیاں لے کر چلتا ہوں تو مجھے میرا بچپن یاد آ جاتا ہے۔اور میں اپنی عمر سے بہت چھوٹا ہو کر بچہ بن جاتا ہوں۔ مجھے اس طرح چلنے میں کوئی عار نہیں ہوتا اور نہ ہی احساس کمتری بلکہ مجھے فخر محسوس ہوتا ہے کہ! میں ایک گھنے سایہ میں ہوں بزرگوں کا یہ سایہ بچوں کو کبھی بوڑھا اور بزرگوں کو عملی زندگی سے ریٹائرڈ نہیں ہونے دیتا۔لیکن کتنے لوگ ہیں جن کو یہ خوش نصیبی میسر ہے۔ اور جن کو میسر ہے۔ وہ اس سے کس حد تک فیضاب ہوتے ہیں آپ بھی اپنی اپنی زندگیوں کا جائزہ لیجئے۔

کہتے ہیں۔ باپ زندہ ہوں۔۔۔۔تو۔۔ کانٹے بھی نہیں چبھتے یا پھر دھوپ بہت ستائے گی جب یہ شجر کٹ جائے گا۔اتنا کہہ کر وہ بیٹا خاموش ہو گیا۔اچانک اسے کچھ یاد آ گیا۔۔۔وہ پھر کہنے لگا۔

چار مصرعے اور سن لیجئے۔

عمارت میں پایہ بڑی چیز ہے
تجارت میں مایہ بڑی چیز ہے
خدا دیر تک رکھ سلامت انھیں
بزرگوں کا سایہ بڑی چیز ہے

ایک انجان سا سناٹا ماحول پر مسلط تھا سب سانپ سونگھ جانے کی سی کیفیت میں تھے سب کو اسی حالت میں چھوڑ کر بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے کھڑے ہوتے ہی سب اپنی اپنی جگہ ادب واحترام سے کھڑے ہو گئے۔

انھوں نے سلام کیا اور چلنے لگے۔ بیٹا بھی تھیلیاں اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

سب کو اپنے اپنے خیالات کے جوابات مل چکے تھے اس لئے سب دم بخود کھڑے تھے۔اس وقت مجھے ایک فلسفی کا قول یاد آ گیا کہ! آپ کسی محفل میں جائیں تو آپ کے استقبال کے لئے کتنے آپ لوگ کھڑے ہوئے۔۔۔یہ اہم نہیں ہے۔۔۔ بلکہ جب آپ وہاں سے چلنے لگو تو کوئی بیٹھا نہ رہے۔یہ اہم ہے۔

□□□

مظفراللہ خاں
انگوری باغ، رام پور، یوپی
Mob.7275043328

شجرافکار کے 'خندہ ہائے گل'

ذاکرحسین ذاکر کی ذات سمندر کے مانند ہے جوظاہری طور پرتو پرسکون رہتا ہے مگراس کے اندر موجوں کا تلاطم کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ان کی شخصیت ظاہر طور پر ایک پرسکون طبیعت سے آگاہ کراتی ہے لیکن ان کے اندر سماج میں رونما ہونے والے واقعات سے جذبات کی طغیانی کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب وہ قلم کو تیشہ کے طور پر استعمال کر کے جراحت کے عمل کوانجام دیتے ہیں۔روزنامہ راشٹریہ سہارا گورکھپور میں ادارت کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے دیوریا کے اس پرجوش لیکن خاموش طبیعت نوجوان سے رابطہ ہوا۔ان کوطویل سفر کر کے گورکھپور آنا پڑتا تھا اور مجھے روز نامہ کے مقامی مدیر کی حیثیت سے ہمہ جہت ذمہ داریوں کے سبب کبھی ان سے پرسکون لمحات میں ملاقات کر کےان کے باطن میں موجود بحر تلاطم کو جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔رسمی اخباری ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر ان کی خاموش طبیعت کے اندر پرت در پرت سماجی ناانصافیوں کی آگ دکھائی دی۔ ان کی تحریروں سے کھول رہے لاوے کا احساس ہوتا ہے۔ان کے الفاظ پگھلے ہوئے فولاد کی مانند زمانہ کے فرعونوں کی سماعتوں کو ماؤف کردیتے ہیں۔زمانہ کی چیرہ دستی کہ فرعونیت کے اس دور میں اب ذاکرحسین ذاکر سے دفتری مراسم قائم نہیں رہ سکےاوروہ ادارے کی حکمتوں کی زنجیر سے آزاد ہوکر اپنے قلم کوتیز سے تیز تر کرتے چلے گئے۔

بہت خوشی ہوئی جب انھوں نے اپنے صحافتی فرائض کا خیال کرتے ہوئے 'ہندوستانی میڈیا اور اردو' کو مرتب کیا۔ یہ کتاب صحافت کے طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک دوسری کتاب ''خندہ ہائے گل'' ہے۔جو ان کے تنقیدی تاثراتی مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔کتاب کا دیدہ زیب سرورق تو ذہن کو تروتازہ کرتا ہی ہےاس کا عنوان بھی ایک آہنگ لئے ہوئے ہے جوشعور کے تاروں کو مضراب کی طرح جھنجھوڑتا ہے۔انسان کا مطالعہ جتنا وسیع ہوتا ہے اتنا ہی اس کے قلم میں تخلیقیت کے جوہر کھلتے رہتے ہیں۔ 13 مختلف انواع کے مضامین ڈاکٹر ذاکرحسین ذاکر کی ادبی دنیا کی سیر کراتے ہیں۔مضمون کے آخر میں حوالہ جات کی طویل فہرست اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ انہوں نے ہر مضمون کا خمیر کتنے وسیع مطالعہ سے گوندھ کر تیار کیا ہے۔آج

کےتن آسانی کے دور میں نئی نسل کے لئے یہ روشن مثال ہے۔ ہم جب اپنے اکابرین کے روشن چراغوں کی رہنمائی میں ادبی سفر جاری رکھیں گے تو ہمیں ٹھاٹھیں مارتے ادبی بحرِ ذخار سے موتی ضرور حاصل ہوں گے۔

ذاکر حسین نے پریم چند کے ناولوں میں مسلم کردار ،اگر آج پریم چند جی ہوتے، اردو ناولوں میں کسانوں کے مسائل، غالب شخص وشاعر، داستان عشق کا شاعر کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی: ادب کا قلندر، غبار خاطر کی دوسری قرآت، شمس الرحمٰن فاروقی پر ایک نوٹ، کئی چاند تھے سر آسماں ایک تنقیدی جائزہ، وزیر خانم کی کردار نگاری، سماع اور اہل تصوف اور حسین بن منصور: ایک باغی صوفی، جیسے اہم موضوعات پر اپنے احساسات کو الفاظ کا پیراہن دے کر مضمون کے طور پر ڈھالا ہے۔ سبھی مضامین پڑھنے کے لائق ہیں۔ قرطاس کا دامن تنگ ہے اس لئے میں چند مضامین پر ہی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہوں۔ تصوف ایک ایسا نازک موضوع ہے جو روحانیت سے معمور قلوب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ورنہ روحانیت کی وادی کی سیر سے غافل شخص اس کے اسرار و رموز کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ سماع اور اہل تصوف پر اپنے قلم سے ذاکر حسین نے دلائل کے ساتھ جو باتیں کی ہیں وہ ذہن قبول کرتا ہے۔ امام محمد غزالی نے اس نازک موضوع کو بہت آسان اسلوب میں بیان کر کے دین سے محبت کرنے والوں کی راہ آسان کی ہے۔ کچھ صوفی سماع کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور چند کے نزدیک سماع اللہ کے عشق کی آگ کو فروزاں کرتا ہے۔ لیکن اس پر تمام اہل صوفیہ کا اتفاق ہے کہ وہ سماع جو لحن داؤدی کی طرز پر ہو، پاکیزہ خیالات کو فروغ دیتا ہے، انسان کے دل میں خضوع وخشوع کو بڑھاتا ہے اور روح کو سرشار کر دیتا ہے۔ جیسے قرآن کی بہترین طریقے سے کی گئی قرأت حمد وثنا کی نغمگی سے پرندے کی تڑپ کا اظہار، وہ سماع جو انسان کو لہو ولعب، فحش جذبات کو بھڑکانے اور بے حیائی کے قریب بھی نہ پھٹکنے دے وہ ہر طبقہ کے لئے جائز ہے۔ موسیقیت کا اثر چرند، پرند، شجر، حجر ہر شے پر غالب رہتا ہے۔ عرب میں حدی خوانی سے شتر کی رفتار میں اضافہ کوئی مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ لیکن ایک حد تک ورنہ شتر کے خون میں پارے کی طرح دوڑ رہی حدی کی نغمگی اس کی جان بھی لے سکتی ہے۔

حسین بن منصور: ایک باغی صوفی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی ملک میں اس کے شہری کی آزادی کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں اس ملک کے دوسرے شہریوں کے حقوق پر ضرب پڑے یا ملک کا آئین متاثر ہو۔ اسی طرح اس دنیا میں زندگی گزارنے اور آخری زندگی کو کامیاب بنانے کا آئین اللہ نے قرآن کی شکل میں انسان کو مرحمت فرمایا ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک کے

انسانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔اس آئین پر پوری طرح عمل کر کے دکھانے والا ایک انسان حضرت محمدؐ کی شکل میں اللہ نے پیدا کیا۔ رحمت کے پیکر پیغمبر اسلام نے قرآنی تعلیمات اور شریعت الٰہی کے مطابق زندگی گزار کر رہتی دنیا کے لئے ایک مکمل مثالی زندگی کا ضابطہ پیش کر دیا جو آخرت کی لازوال زندگی کا پیش خیمہ بھی ہے۔اس بات پر ہر مسلک کے علما مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ انسانوں میں سے افضل ترین ہستیاں انبیا ورسل، تمام انبیا میں افضل ترین نبی ورسول پیغمبر آخرالزماں حضرت محمدؐ ہیں۔ان کے بعد بالترتیب خلفائے راشدین، صحابہ کرام، تابعین، تبعہ تابعین اور اولیا اللہ ہیں۔ کوئی کتنا ہی بڑا صوفی اور ولی اللہ ہو وہ تبعہ تابعین کی فضیلت حاصل نہیں کرسکتا۔ان اصولوں کی جو پاسداری کرتا ہے وہ صراط مستقیم پر گامزن رہتا ہے۔شریعت کی سرمو انحراف کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔شریعت کی حدود ہر عاقل اور بالغ پر نافذ ہوتی ہیں۔کوئی شخص جذب کی حالت میں ہو اور وہ خلاف شرع کام کرے تو اللہ کی عائد کردہ شریعت کے تحفظ کے لئے اس پر حد جاری ہوگی۔حسین بن منصور کے معاملے کو بھی اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔اگر ہم ذرا سی جذباتیت کے شکار ہوئے اور شریعت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے کوئی غلط نظریہ قائم کرلیا تو وہ ہمیں حق وانصاف کی شاہراہ سے دور کرتا چلا جائے گا۔ہوش وخرد سے بیگانگی جذب کی حالت کا تعلق اللہ اور اس کے بندے سے ہے۔لیکن اسلامی معاشرہ میں شریعت کی پابندی لازمی ہے۔

''ساحر لدھیانوی: ادب کا قلندر'' میں صاحب کتاب نے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ یہ بہت ناقابل یقین اور بے رحم حقیقت ہے کہ ساحر کی فن کارانہ خدمات اور ان کی شعری عظمت پر بہت کم لکھا گیا۔انہیں اس طرح نظر انداز کیا گیا جیسے ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ساحر کا کلام اردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔جب بھی کیفی اعظمی، علی سردار جعفری اختر الایمان، مجاز، جاں نثار اختر کا نام لیا جاتا ہے ساحر خود بخود اپنے بے مثال کلام کی بدولت ادب کے فلک پر جگمگانے لگتے ہیں۔ان کی نظمیں انسان کے شکست خوردہ جذبوں کو جلا بخشتی ہیں۔تاج محل ان کی شاہکار نظم ہے۔ ملک کے ممتاز ادبی جریدہ 'آج کل' نے ساحر پر خصوصی نمبر شائع کیا۔اس سال ہندی کے سہ ماہی رسالے 'نیا پتھ' نے ساحر پر بہترین خصوصی نمبر نکالا۔ساحر کے یوم پیدائش کے صد سالہ جشن کے موقعے پر اپریل تا جون 2021 کا یہ خصوصی نمبر اس بات کا ضامن ہے کہ ساحر نے اردو ادب ہی نہیں بلکہ ہندی ادب کو بھی اپنے سحر سے اچھوتا نہیں چھوڑا ہے۔223 صفحات کی خندہ ہائے گل ذاکر حسین ذاکر کی ایک اور کامیاب ترین کتاب ہے۔یہ اردو ادب میں ایک حوصلہ افزا اضافہ کے طور پر یاد رکھی جائے گی۔ایسا میرا یقین ہے۔

❑❑❑

تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجنا لازمی ہے۔

تبصرہ

نام کتاب	:	آوارگی بڑھتی رہی
شاعر	:	ذوہیب فاروقی افرنگ
صفحات	:	
قیمت	:	۳۵۰/-روپئے
سنہ اشاعت	:	۲۰۲۲ء
ملنے کے پتے	:	ا۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۲۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
مبصر	:	محی بخش قادری
موبائل نمبر	:	9839018959

زیر نظر کتاب ایک نوجوان ابھرتے ہوئے شاعر ذوہیب فاروقی افرنگ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔اس مجموعہ میں 132 غزلیں اور 8 نظمیں شامل کی گئی ہیں۔کتاب میں مصنف کی اپنی بات کے علاوہ واصف فاروقی، اقبال مسعود اور ڈاکٹر واصف یار کے تعارفی و تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں جن سے شاعر اور شاعر کی شعری کاوش کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

ذوہیب فاروقی کا آبائی وطن ہردوئی ضلع کا ایک مردم خیز قصبہ سندیلہ ہے جس نے بہت سے معتبر شاعر و ادیب پیدا کیئے۔ ذوہیب فاروقی کی پرورش لکھنؤ کی علمی و ادبی فضاؤں میں ہوئی۔

ذوہیب فاروقی افرنگ ابھی تقریباً تیس برس کے نوجوان ہیں لیکن ان کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی سے ان کی فکر و شعور ان کی عمر سے کہیں آگے ہے۔

تم جیسی ندیوں کو میسر نہیں ہوں میں
آتش فشاں ہوں کوئی سمندر نہیں ہوں میں
جھیلوں غرور و ناز و تکبر جو آپ کے
عاشق ہوں، کوئی آپ کا نوکر نہیں ہوں میں
مجھ پر ترس نہ کھایئے جانے بھی دیجئے
ان تلخیوں کا آج سے خوگر نہیں ہوں میں
مجھ کو کچھ اور لوگ بھی رکھتے ہیں قلب میں
دل سے ترے نکل کے بھی بے گھر نہیں ہوں میں

واصف فاروقی لکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا اشعار میں جس مزاج کا اندازہ ہو رہا ہے اس میں انا سے کہیں زیادہ خود شناسی نظر آتی ہے اور اگر کوئی فنکار عمر کی اس منزل میں ہی خودشناسی کے ہنر سے واقف ہو جائے تو اسے زمانہ شناس ہونے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

اقبال مسعود لکھتے ہیں کہ افرنگ کی زبان سادہ،

سہل،سلیس اور پرکار ہے۔ یہ سادگی ادب کو جدیدیت کا تحفہ ہے اوراس کے نتیجے میں ابلاغ کا وسیع تر ہونا ممکن ہوگیا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کی ساری کائنات اوراس کے پیچیدہ موضوعات شاعر کے سامنے ایسے واہو گئے جیسے ''کھل جا سم سم'' کہنے سے علم و معلومات کے بیش بہا خزانے اپنے دروازے کھول دیتے ہیں اور دنیا کی وسعتیں حیران کن اور پریشان کن حدتک پھیل جاتی ہیں۔

افرنگؔ کی زبان سلیس ہے محاوروں کا استعمال بھی آپ نے بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ابھی شعروادب کا سفر شروع ہوا ہے لیکن کلام کی پختگی بتاتی ہے کہ برگ نو ایک روز شجر بلند و بالا ہوگا۔

ڈاکٹر واصف یار لکھتے ہیں کہ ذوہیب فاروقی افرنگ کے متعدد اشعار ایسے ہیں جن سے ان کی علمی لیاقت اور حکمت ظاہر ہوتی ہے لیکن انہوں نے اپنی شاعری کو خودنمائی کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کبھی شدت غم میں ملوث ہوکر پڑھنے والوں کو غمگین کرنے کی کوشش کی ہے نہ اپنی دیانت داری سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیرنظر کتاب کے مصنف نے اپنی بات کے عنوان سے ایک صفحہ میں ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی بات ختم کردی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر کو اپنی شعری صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہی قاری ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کرسکتا ہے۔کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان شاعر ذوہیب فاروقی افرنگؔ بہترین شاعر ہیں اور انہیں زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ قدیم و جدید رجحانات کا ایک خوبصورت سنگم ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ زیرنظر کتاب کے لئے ذوہیب فاروقی افرنگؔ مبارکباد اور تحسین کے لائق ہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ ان کی کتاب ادبی حلقوں میں خوب پسند کی جائے گی اور اس حوصلہ افزائی سے ان کی نئی کاوش پھر سے قارئین کے سامنے ہوگی۔کتاب سے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

کچھ ہو نہ سکے آپ بھی تب پوچھ رہے ہیں
کیوں ہم سے اجڑنے کا سبب پوچھ رہے ہیں

مری دشواریاں تم بھی تو سمجھو
میں سمجھوں گا تمہارے مسئلے بھی

لہو اگر بہانا ہے تو جہل کا بہایئے
جو تیغ ہی اٹھانی ہے تو علم کی اٹھایئے

وہ جن کے حوصلوں میں دم نہیں ہے
وہ سوچیں گے انھیں قسمت نے مارا

کیا نہ حاصل ہوا ہمیں پھر بھی
کیوں یہ احساس رائگانی ہے

جسم کی قید میں کیا روح کی مرضی صاحب
جا نہ پائے کہ جدھر جانے کو جی چاہے ہے

تمہاری ذات سے سب کچھ حسیں تھا
تمہارے بعد کچھ اچھا نہیں ہے

❑❑❑

R. No. 25039/72

U.P. Urdu Akademi

Khabarnama

उ.प्र. उर्दू अकादमी ख़बरनामा

اُتر پردیش اُردو اکادمی خبرنامہ

Vol. No. 52 | July - August 2023 | Issue No. 1, 2

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں